کیمیاگر

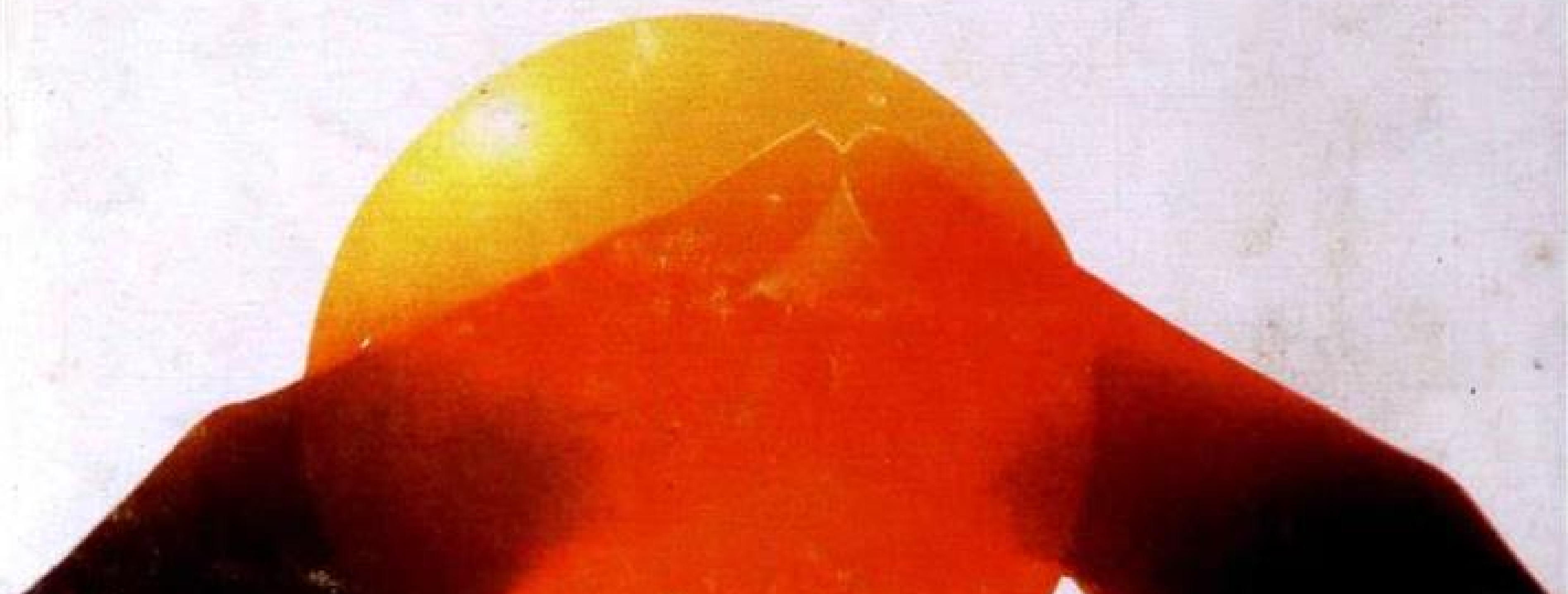

شوکت صدیقی

کیمیاگر

کیمیاگر

شوکت صدیقی

ناشر
رکتاب کراچی

جُملہ حقوق محفوظ

اشاعتِ اوّل : فروری ۱۹۸۴ء

مطبع : احباب پرنٹرز

: ۲/۴۳/۶ لیاقت آباد کراچی

قیمت : چالیس روپے

ناشر

رکتاب

۸۴ فاطمہ جناح کالونی کراچی ۵

فہرس

ڈھپالی ——— ۷

خفیہ ہاتھ ——— ۳۳

کیمیاگر ——— ۸۱

خداداد کالونی ——— ۱۲۱

میموریل ——— ۱۵۹

ڈھپالی

جاڑوں کی رات تھی۔ سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ میری ہمیشہ کی عادت ہے کہ دیر سے سوتا ہوں۔ کبھی اول شب نیند نہیں آئی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ گھر کے اور افراد تو کب کے اپنے اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ میں کچھ دیر تو ایک جاسوسی ناول پڑھتا رہا، پھر یوں ہی بیٹھے بیٹھے گنگنانے لگا۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا!!

نہ پھول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا!

اے باغباں تجھے کیا، کیا نشان بتلاؤں۔

دوسرے شعر کا مصرعۂ ثانی اب یاد نہیں۔ غالباً آرزو لکھنوی کی غزل کا شعر ہے۔ ان دنوں فلم "دیوداس"، نئی نئی ریلیز ہوئی تھی۔ سہگل کے گانوں سے گلی کوچے گونجتے تھے جسے دیکھو الاپ رہا ہے۔

بالم آن بسو مورے من میں۔

مگر یہ غزل، پہاڑی سانیال نے گائی تھی۔ فلم میں تو یہ گانا مجھے زیادہ پسند نہ آیا لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میں اسے گنگنانے لگا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں کئی سال بعد لکھنؤ واپس آیا تھا۔ پرانا گھر چھوٹ چکا تھا اور نئے گھر میں یہ میری پہلی رات تھی۔ پچھلے گھر سے بہت سی ایسی یادیں وابستہ تھیں، جن کے اظہار کا یہاں موقع نہیں۔

گنگناتے گنگناتے مزے میں جو آیا، تو اونچے سُروں میں گانے لگا۔ میرا کمرہ سب سے الگ تھلگ سڑک کے رخ پر تھا۔ لہٰذا یہ خدشہ بھی نہ تھا کہ گھر میں کسی کی نیند خراب ہو گی۔ پوری غزل ختم بھی نہ ہوئی تھی، دفعتاً کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

میں لحاف میں دبکا دبکایا بیٹھا تھا۔ باہر نکلنے کو جی نہ چاہا۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے اونچی آواز سے پوچھا: "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی: "ذرا دروازہ تو کھولیے۔"

لہجہ میرے لیے بالکل نامانوس اور اجنبی تھا۔ خدا معلوم کون اس جاڑے پالے میں نازل ہوا تھا۔ بادل نخواستہ لحاف چھوڑا۔ سردی سے کپکپاتا بستر سے نیچے اترا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے ایک ادھیڑ آدمی کھڑا تھا۔ جنگلی کبوتر کی سی سُرخ سُرخ آنکھیں، موٹی پکوڑا سی ناک، گھنی مونچھیں، سر پر لکھنوی بانکوں کے سے پٹّے، کالا توا چہرہ اور اس پر عجب سی کرختگی۔ بڑا ہی بدشکل آدمی تھا۔

اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور نہایت بے تکلفی سے کمرے کے اندر آ گیا۔ اپنی پرانی اُونی شال سنبھال کر جسم کے گرد لپیٹی اور کرسی کھسکا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ میں ابھی تک گُم صُم کھڑا تھا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر گویا ہوا: "کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھ جایئے۔"

میں گومگو کے عالم میں قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پیر سے جوتا نکالا اور سامنے ڈال دیا۔ لہجے میں رقّت پیدا کرتے ہوئے گھگھیا کر بولا: "دس جوتے مار دیجیے۔"

میں سٹ پٹا کے رہ گیا۔ یا اللہ، یہ اس وقت کیا مصیبت آئی۔ مجھے خاموش اور بھونچکا دیکھ کر اس نے اور رقّت آمیز لہجے میں کہا: "اجی، دیکھ کیا رہے ہیں، اٹھایئے نا جوتا۔" اس کا ہاتھ اپنے سر پر گیا۔ ٹوپی اتاری اور گردن جھکا کر سامنے کر دی۔

"لیجیے یہ سر حاضر ہے۔"

جی تو بہت چاہا کہ دس کے بجائے تڑا تڑ بیس جڑنے لگاؤں۔ سخت طیش آیا لیکن جب قدرے مجھے

طیش آ رہا تھا، وہ اسی قدر بھیگی بلّی کی طرح مسکین بنا بیٹھا تھا۔ سمجھ ہی میں نہ آیا، کیا کروں، کیا کہوں۔ عجب افتاد پڑی تھی۔ ذرا غور تو کیجئے۔ ایک اچھا بھلا آدمی آپ کے سر ہو جائے کہ دس جوتے مار دیجئے اور وہ بھی خواہ مخواہ ایسی صورت میں بجز حواس باختہ ہو جانے کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

مجھے ششدر دیکھ کر کہنے لگا: "نہیں مار سکتے۔" اس دفعہ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ ہونٹوں پر زہرخند تھا۔ اپنی سُرخ سُرخ آنکھوں سے گھور کر مجھے دیکھا۔ گردن اونچی کی۔ آواز میں کھرج پیدا کرتے ہوئے تنبیہہ کی: "تو پھر للّٰہ، آئندہ یہ راگ نہ الاپیے گا۔" وہ نرم پڑ گیا اور میرے آگے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

اس حرکت پر غصہ بھی آیا، ہنسی بھی۔ مجھے اپنے بے سُرے پن کا کسی نے اتنی شدّت سے احساس نہیں دلایا تھا مگر بات کہنے کا اس نے جو انداز اختیار کیا تھا وہ بڑا انوکھا اور عجیب و غریب تھا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ اب بھولے سے بھی کبھی نہیں گنگناؤں گا۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ وہ تھا کون۔

یہ معمّہ ذرا دیر بعد اس نے خود ہی حل کر دیا۔ نہایت ادب سے گویا ہوا: "معاف کیجئے گا اس گستاخی کو۔ میں بہت دیر سے بستر پر لیٹا، آپ کی آواز سن رہا تھا۔ بہت ضبط کیا مگر جب مجبور ہو گیا تو اٹھ کر آپ کے پاس چلا آیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے بھی گانے بجانے سے کچھ لگاؤ ہے۔ جس دھن میں آپ گا رہے تھے، وہ راگ اساوری ہے۔ اسے یوں الاپتے ہیں۔" اس نے مدھم سُر میں گنگنانا شروع کر دیا۔ چند منٹ تک ایک ہی مصرعہ الاپتا رہا پھر اس نے راگ اساوری پر باقاعدہ لیکچر دیا۔ جوتا اٹھا کر پہنا، سر پر ٹوپی رکھی اور پرانی شال سنبھالتا ہوا اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد، میں دیر تک دم بخود بیٹھا رہا۔ رہ رہ کر یہ خیال ستاتا کہ یہ غزل تو بہت مہنگی پڑی۔

(۲)

استاد رشیدی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ہی ملاقات میں ان کی شخصیت سے

اتنا مرعوب ہوا کہ آج تک کبھی غسل خانے میں بھی گنگنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ان کا اصل نام کیا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں، مگر عرفِ عام میں وہ استاد شیدی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ صورت شکل سے بھی وہ حبشی نژاد نظر آتے تھے۔ میرے پڑوس میں رہتے تھے۔ محلے میں ان کے علاوہ اور بھی گانے بجانے والے تھے۔ وہ کشمیری بھانڈ کہلاتے تھے۔ عورتوں کی طرح باقاعدہ لمبی لمبی چوٹیاں رکھتے تھے اور مردانہ لباس میں بڑے عجیب و غریب نظر آتے تھے لیکن جب وہ مجرا کرتے تو نوجوانوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ گوٹا کناری لگے لہنگے اور چولیاں پہنے جب وہ زرتار دوپٹے کا گھونگٹ نکال کر بھاؤ بتاتے اور ساز و آواز کا جادو جگاتے تو ان کے سامنے کبھی کبھی مشہور طوائفوں کا رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا۔

ان میں سب ہی رقص کرنے والے نہیں تھے۔ بعض صرف نقل کرتے تھے پھبتیاں کستے تھے ٹھٹول بازی کرتے تھے۔ اہل محفل کو ہنساتے تھے۔ داد وصول کرتے تھے۔ انعام و اکرام پاتے تھے۔ جن کی عمر ڈھل گئی تھی، وہ محض گانا گاتے تھے یا کبھی کبھار کسی پرانے قدردان کی فرمائش پر مجرا بھی کر لیتے تھے۔ ورنہ عام طور پر یہ نوجوانوں کا حصہ تھا۔

ان دنوں کرامت جان کا بھانڈوں میں بڑا شہرہ تھا۔ اس کی یہ شہرت "چندر راولی" کی بدولت تھی۔ "چندر راولی" نوٹنکی کے طرز کا ایک کھیل تھا۔ ایک رہس تھا۔ کرامت جان کی منڈلی "چندر راولی" کو بڑے موثر انداز میں پیش کرتی تھی۔ کرامت جان خود چندر راولی کا کردار ادا کرتا تھا اور اس خوبی سے ادا کرتا تھا کہ اس پر کسی نازنین کا گمان ہوتا تھا۔ تھا بھی خوش شکل، چھریرا جسم، سبک ناک نقشہ، آواز میں سُر کا رس۔ چندر راولی کے روپ میں جب وہ رقص کے ساتھ ساتھ گانا بھی گاتا تو سماں بندھ جاتا۔

سنا ہے استاد شیدی ایک زمانے میں کرامت جان کے چچا فرحت جان کی منڈلی میں شامل تھے اور "چندر راولی" میں ڈاکو دربجے سنگھ کا کردار ادا کرتے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں، جب وہ اپنے کالے کلوٹے چہرے پر کالک مل کر، سرخ سرخ انگارہ سی آنکھیں نکال کر سپاہیوں کو ڈانٹتے اور طبلے

کی تھاپ پر لہک لہک کر تان لگاتے: "رسی کر دو دراز، باندھو کمر سے چست" تو ان کی پاٹ دار آواز سے سنسنی پھیل جاتی تھی۔ اہل محفل کے خون کی گردش تیز ہو جاتی۔

نجّے تو وہ بھی ذات کے بھانڈ، مگر ان کا تعلق کشمیری بھانڈوں کے نچلے طبقے سے تھا، جن کو ڈھپالی کہا جاتا ہے۔ ڈھپالی عام طور پر طبلہ منڈھنے کا کام کرتے ہیں۔ استاد شیدی بھی لڑکپن میں طبلوں پر کھال منڈھتے تھے۔ مزاج میں سرکشی اور تنک چڑھاپن ہمیشہ سے تھا۔ ایک بار کسی کاریگر سے لاگ ڈانٹ ہو گئی۔ اسی روز روپے، سوا روپے کی روزی پر لات ماری اور استاد کلّن خان کے پاس پہنچے۔ وہ مادھو لال کی چڑھائی پر رہتے تھے اور اپنے وقت کے مانے ہوئے سارنگی نواز تھے۔

جن لوگوں نے انھیں استاد کلن کی شاگردی میں دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے استاد کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ چلمیں بھرنا اور پاؤں دبانا تو خیر روزمرہ کی بات تھی۔ بیماری کے زمانے میں انھوں نے استاد کو اپنے ہاتھوں پر تھکوایا تھا۔ تین چار میل روزانہ استاد کو پیٹھ پر پشتارے کی طرح اٹھا کر اسپتال لے جاتے تھے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ بیماری میں استاد کلّن کچھ زیادہ ہی چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ویسے بھی ان کا مزاج، خدا کی پناہ۔ بگولہ تھے بگولہ۔ غصّہ طاری ہو جاتا تو دیوانے ہو جاتے۔ جو چیز ہاتھ آئی، اٹھا کر کھینچ ماری۔ اس سے غرض نہیں کہ سر پھٹ گیا یا انگلیاں فگار ہوئیں لیکن پانچ سال کی سخت ریاضت کے بعد جب وہ استاد کلّن کے در سے نکلے تو اپنے فن میں کامل تھے۔

میں نے جس وقت استاد شیدی کو دیکھا، وہ کشمیری بھانڈوں کی سنگت چھوڑ چکے تھے۔ ان دنوں وہ چوک کی طوائفوں کو تعلیم دیتے تھے۔ اسے وہ ٹیوشن کہتے تھے۔ روزانہ غروب آفتاب سے کچھ پہلے وہ ٹیوشن کے لیے گھر سے نکلتے۔ اس وقت ان کی وضع قطع یہ ہوتی۔ سر پر دوپلی ٹوپی، ڈھیلی ڈھالی اچکن، چوڑی دار پائجامہ، پیروں میں براؤن پمپ شو اور بغل میں غلاف کے اندر لپٹی ہوئی سارنگی دبی ہوتی۔

طوائفوں کے علاوہ استاد گھر پر بھی کچھ نوجوانوں کو گانے کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے یہ شاگرد

عام طور پر ہندو ہوتے۔ گالیاں بکنے میں استاد کا جواب نہ تھا۔ یہ خصوصیت ان میں استاد کلّن سے منتقل ہوئی تھی، مزاج بھی ویسا ہی پایا تھا۔ ذرا سی بات پر ہتھوں سے اکھڑ جاتے۔ ایسے برہم ہوتے کہ یہ بھی نہ دیکھتے کہ منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ جو جی میں آتا، اول فول بکتے چلے جاتے۔

گھر پر ان کے جو شاگرد تعلیم حاصل کرنے آتے، ان میں بیشتر اعلا تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوان تھے۔ نیپال کے شاہی خاندان کا ایک نوجوان بھی، ان کا شاگرد تھا۔ رانا جوگندر بہادر نام تھا۔ نہایت شائستہ اور ہنس مکھ تھا۔ موسیقی سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ یہی شوق اسے کشاں کشاں لکھنؤ لے آیا۔ مجھ سے بھی اس کی تھوڑی سی یاد اللہ ہو گئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بسنت پنچمی کے دوسرے دن کا ذکر ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کو خط لکھ رہا تھا۔ استاد کا مکان عین میرے کمرے کے مقابل تھا۔ درمیان میں پندرہ فٹ کی پختہ سڑک تھی۔ استاد کی بیٹھک کی ایک ایک بات مجھے سنائی دیتی تھی۔ اس وقت رانا جوگندر بہادر کو موسیقی کا درس دے رہے تھے۔ راگ راگنیوں کے نام تو مجھے اب تک یاد نہ ہو سکے البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ اس روز وہ کوئی نیا راگ بتا رہے تھے۔ رانا ٹھیک سے بول ادا نہیں کر رہا تھا۔ استاد کئی بار اپنی پاٹ دار آواز میں اسے ٹوک چکے تھے۔ اچانک دوپہر کی خاموشی میں استاد زور سے دھاڑے۔

"ابے ہوش میں ہے یا بھنگ چڑھا کر آیا ہے؟"

رانا خاموش رہا۔ استاد نے ایک بار پھر اسے سمجھایا۔ دو تین بار خود اونچے سروں میں راگ کے بول الاپے مگر رانا سے پھر چوک ہو گئی۔ استاد نے نہایت ثقیل سی گالی دی۔ ڈپٹ کر بولے "ابے پھر دہی پنچم میں۔ اب کے جو بہکا تو سالے کے حلق میں سارنگی کا پورا گز اتار دوں گا۔"

رانا اس بار بھی خاموش رہا۔ استاد دیر تک الاپتے رہے۔ رک رک کر ہر بول سمجھاتے رہے۔ رانا جوگندر بہادر نے از سر نو سا رے گا ما، پا دھا نی الاپنا شروع کیا مگر بات بن نہ سکی۔ استاد جل کر بولے "دھت تیرے کی۔ تجھے سکھانے والے کی" انھوں نے غضب ناک ہو کر اپنی مری ہوئی ماں

کو بھی نہ بخشتا۔ استاد نے گلا پھاڑ کر رانا کو دھتکارا۔

"اچھا اب تم بڑھاؤ اپنا ٹٹو۔" انھوں نے قدرے تامل کیا۔ "ابے اب جاتا ہے یا کچھ لے کر جائے گا۔"

پھر کوئی آواز نہ ابھری۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ میں اٹھا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ رانا دروازے کے باہر کھڑا خوشامد کر رہا تھا۔ استاد اندر چپ بیٹھے تھے۔ کھلے دروازے سے ان کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پر جھنجلاہٹ طاری تھی۔ ذرا دیر بعد استاد اٹھے اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ رانا بے چارہ منہ لٹکائے دیر تک دھوپ میں کھڑا رہا مگر دروازہ نہ کھلا۔ استاد نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ رانا چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اسے پھر کبھی نہ دیکھا۔

لیکن اس سے زیادہ ایک اور عبرت ناک منظر دیکھنے میں آیا۔ اس روز بھی استاد شیدی کسی شاگرد کو ڈانٹ پھٹکار رہے تھے اور شاگرد ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود بار بار غلطی کر رہا تھا۔ یکایک اونچی آواز سے گالیاں بکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ ایک نوجوان دروازہ کھول کر استاد کی بیٹھک سے باہر نکلا۔

یہ میرے ایک ملنے والے گوکل چند رستوگی تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ مزاج میں رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا۔ شعر و شاعری سے بھی خاصا شغف تھا۔ موسیقی کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ میں نے غور کیا۔ وہ اس وقت سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گوکل چند رستوگی باہر نکلے ہی تھے کہ استاد بھی دروازے سے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں سارنگی بجانے کا گز تھا۔ گوکل نے استاد کو دیکھا تو چپل چھوڑ کر، دھوتی سنبھالتے ہوئے سڑک پر ننگے پاؤں بھاگنا شروع کر دیا۔ استاد چیختے چلاتے پیچھے پیچھے دوڑے۔ کوئی سو، سوا سو گز تک دوڑتے رہے۔ راہ گیر ٹھٹک کر رہ گئے۔ دکان دار دکانوں سے نکل کر باہر آ گئے۔ حیرت سے دیکھنے لگے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ استاد لوٹے تو سانس پھولی ہوئی تھی۔ منہ

سے کف جاری تھا۔ ہاتھ میں گز دبا تھا اور زبان پر گالیاں تھیں۔

ان کی اسی بد دماغی سے نالاں ہو کر اکثر شاگرد چند ہی روز میں بھاگ کھڑے ہوتے۔ کسی طوائف کے یہاں بھی وہ زیادہ دن نہ ٹکے۔ ان دنوں وہ لکھنؤ کی مشہور طوائف دل ربا کی ایک نوچی کو راگ راگنی سکھاتے تھے۔ ویسے وہ آئی ٹی کالج میں پڑھتی تھی مگر تھی تو رنڈی کی بیٹی عشوہ و ادا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ بلا کی شوخ تھی۔ بات بات پر اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ ایک روز بار بار ٹوکنے پر بھی وہ برابر غلط سر نکال رہی تھی۔

استاد سخت بھنائے ہوئے تھے۔ جل کر بولے "اب کے اس طرح انترا لگایا تو سالی منہ توڑ کے رکھ دوں گا۔" مگر اس نے آستائی کے بعد پھر اسی سُر میں انترا لگایا۔ غضب یہ کیا کہ دانت نکال کر کھی کھی کرنے لگی۔ اس کی ہنسی پر استاد کے غصے کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس قدر برہم ہوئے کہ قریب رکھا ہوا شیشے کا گلاس اٹھا کر کھینچ مارا۔ بھوں پھٹ گئی۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخی۔

"ہائے اماں میں مرگئی۔"

چاروں طرف سے رنڈیاں اور بھڑوے دوڑ پڑے۔ لڑکی کی پیشانی سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ دل ربا نے اس کی حالت زار دیکھی تو سر پیٹ لیا لیکن وہ ڈیرے دار طوائف تھی۔ ہر وقت کا رئیسوں کے ساتھ سابقہ تھا۔ مزاج میں تحمل اور رکھ رکھاؤ تھا۔ غصے کو بردباری سے ضبط کیا۔ ہاتھ جوڑ کر استاد سے صرف اس قدر کہا۔

"استاد ہم تو باز آئے اس تعلیم سے۔ خدانخواستہ بچی کی آنکھ جاتی رہتی تو سمجھ لیجئے، اس کی تو ہمیشہ کے لیے قسمت پھوٹ گئی تھی۔"

استاد ذرا بھی مطلق نہ پسیجے۔ تیوری پر بل ڈال کر بولے "مجھ سے تعلیم دلوانا ہے تو یہی ہو گا ورنہ کسی اور کو ڈھونڈ لو۔ شہر میں بہت سے گویے پڑے ہیں۔"

انہوں نے سارنگی پر غلاف چڑھایا اور بغل میں دبا کر بالاخانے سے نیچے اتر گئے۔ دوبارہ

بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ دل رُبا خود منانے آئی تھی۔ مشاہرہ بھی نہایت معقول دیتی تھی مگر استاد شیدی اس قدر خفا تھے کہ کسی طور راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے اسی روز عہد کر لیا کہ آئندہ کسی طوائف کو موسیقی کی تعلیم نہیں دیں گے۔ ہوا بھی یہی کہ پھر کبھی بغل میں سارنگی دبا کر شام کو چوک کی جانب جاتے نظر نہ آئے۔

استاد شیدی کی بد دماغی صرف شاگردوں ہی تک موقوف نہ تھی۔ گھر والے اور زیادہ زیرِ عتاب رہتے۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں اور صرف ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کا نام منصور علی تھا۔ سب سے بڑا بھی وہی تھا۔ گانے بجانے میں اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ استاد کا یہ عالم تھا کہ جہاں فرصت ملی۔ سارنگی اٹھائی اور منصور علی کو تعلیم دینی شروع کر دی۔ ذرا چُوکا، استاد نے گالی دی۔ زیادہ جھنجلائے تو ہاتھ بھی چھوڑ بیٹھے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مار پیٹ اور گالی گلوچ سے کام نہ چلا تو دالان کے کھمبے سے باندھ کر چابکوں سے منصور علی کی کھال ادھیڑتے۔ اس وقت گھر پر دہشت طاری ہوتی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ٹوکے مگر کوئی نہ کوئی لڑکی بھائی کی محبت میں بے قرار ہو جاتی۔ گڑگڑا کر کہتی "اللہ ابا، اب بھیّا کو نہ ماریے"! استاد خونخوار نظروں سے گھور کر اسے دیکھتے۔ موٹی سی گالی دے کر اسے بھی گھسیٹ کر کھمبے سے باندھ دیتے۔ اب دونوں پر مار پڑتی۔ اسی اثنا میں کسی اور لڑکی کی شامت آجاتی۔ وہ بھی بول پڑتی۔ اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔

استاد کے گھر کا دالان خاصا طویل تھا۔ اس کے چھ سات ستون تھے۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ منصور علی کے ساتھ ساتھ تینوں لڑکیاں بھی دالان کے کھمبوں سے بندھی ہیں اور باری باری ہر ایک کے چابکیں پڑ رہی ہیں۔ بیوی ان کی طبعاً کچھ بے حس واقع ہوئی تھیں۔ خاموش بیٹھی تماشا دیکھتی رہتیں۔ جب یہ الم ناک نظارہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا تو اٹھ کر پڑوس کے کسی گھر میں چلی جاتیں اور

جو شامتِ اعمال کہیں بول پڑتیں تو وہ بھی کھمبے سے باندھ دی جاتیں۔

یہ عجب ڈرامائی منظر ہوتا۔ استاد شیدی ہاتھ میں چابک دبائے اس سرے سے اس سرے تک ٹہل رہے ہیں۔ جس نے فریاد کے لیے زبان کھولی، سٹراک سے اس کے ایک چابک پڑی۔ کبھی خاموش رہنے پر بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سٹراسٹر چابکیں برساتے چلے جاتے۔

ایسے موقعوں پر اکثر ان کی چھوٹی بیٹی مشکل کشائی کرتی۔ وہ استاد کی نظر بچا کر باہر چلی جاتی اور استاد کے ماموں کو بلا کر لاتی۔ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ لاٹھی ٹیکتے، کپکپاتے ہوئے آتے اور اپنے پوپلے منہ سے وہ، وہ گالیاں سناتے کہ استاد کے ذخیرے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گالیوں کا اضافہ ہو جاتا۔

استاد دھڑا دھڑ گالیاں سنتے مگر دم نہ مارتے۔ بات یہ تھی کہ استاد شیدی کی والدہ کا انتقال ان کی کم سنی ہی میں ہو گیا تھا۔ ماموں نے ان کو پالا پوسا تھا۔ لہٰذا وہ ان کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ بد دماغی کے باوصف کبھی ماموں کو پلٹ کر جواب نہ دیا۔ بڑے میاں آتے تو سب اسیروں کو رہائی نصیب ہوتی جب کبھی ایسا معرکہ پڑتا۔ ماموں کی آواز سنتے ہی استاد رفوچکر ہو جاتے۔ رات کو دیر سے گھر لوٹتے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ واپسی پر مٹھائی کا دونا ہاتھ میں نہ دبا ہو۔ آتے ہی بیوی کو مناتے ایک ایک بچے کو جگاتے، چمکارتے اور اصرار کر کے خود اپنے ہاتھ سے ہر ایک کو مٹھائی کھلاتے۔ ان کے کردار میں ایسے ہی اور نہ جانے کتنے تضادات تھے۔

گالیاں بکنے کے معاملے میں وہ بہت پھوہڑ تھے۔ جہاں غصہ آیا، بھڑ سے گالی دے بیٹھے۔ ایک روز ایسا ہوا۔ سہ پہر کو وہ منصور علی کو موسیقی کی تعلیم دے رہے تھے۔ اس نے کوئی غلط سُر نکالا۔ استاد نے حسبِ معمول نہایت غلیظ گالی دی۔ قریب ہی ان کی بیوی بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ انھوں نے جیبیں بہ جبیں ہو کر ٹوکا۔ "ذرا تو کسی کا خیال کیا کرو۔ سیانی سیانی لڑکیاں گھر میں موجود ہیں اور تم ہو کہ جو منہ میں آیا بک دیا۔ تمھاری ان گالیوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔"

استاد نادم ہونے کے بجائے ایک دم بھڑک اٹھے۔ بگڑ کر بولے "اچھا تو اب ہم گالی بکتے ہیں"۔

ساتھ ہی انھوں نے بیوی کے بارے میں نہایت واہیات بات کہی۔ گلا پھاڑ کر چیخے: "یہ اولادیں تم جہیز میں اپنے ساتھ لائی تھیں؟" بیوی بے چاری کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر ان کی آواز سنائی نہ دی۔

استاد شیدی نے طوائفوں اور طوائف زادیوں کو فن موسیقی کی تعلیم دینے کا سلسلہ بند کیا تو گھر پر شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ اب انھوں نے اپنا نام استاد شیدی کے بجائے مرزا شیدا علی بیگ رکھ لیا تھا۔ شاگرد پہلے انھیں استاد کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اب مرزا صاحب کہنے لگے تھے۔ اگر بھولے سے کوئی انھیں استاد کہہ کر مخاطب کرتا تو بھڑک اٹھتے۔ کبھی کبھی تو گالیاں دینے سے بھی نہ چوکتے۔

(۳)

استاد کا بیشتر وقت گھر ہی پر گزرتا تھا۔ سویرے ہی سویرے سارنگی لے کر بیٹھ جاتے اور رات گئے تک راگ راگنیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان دنوں ان میں ایک نیا مرض یہ پیدا ہوگیا تھا کہ فن موسیقی پر لیکچر دیتے دیتے بات بات پر لیکچر دینے لگتے۔ معلوم نہیں ان کے سر میں یہ خنّاس کیسے سمایا اور کیوں سمایا۔ بہر حال اس نئی عادت کی مشق ستم عام طور پر بے چاری بیوی بنتی۔ وہ سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ استاد تھے کہ موسیقی کے بارہ ٹھاٹھ بیان کرتے کرتے ہر موضوع پر بحث شروع کر دیتے۔ اکثر رات کے سناٹے میں استاد کی پاٹ دار آواز سنائی دیتی۔ وہ اس وقت کسی مسئلے پر لیکچر دینے میں ہمہ تن مصروف ہوتے۔ یہ لیکچر ذرا ذرا سی گھریلو باتوں سے شروع ہوتے اور رفتہ رفتہ ان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا۔

یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ یہ لیکچر بازی ان کو راس آگئی۔ وہ میوزک کالج میں باقاعدہ لیکچرار مقرر ہو گئے۔ اس اعزاز سے استاد کی وضع قطع میں تو کوئی فرق پیدا نہ ہوا، البتہ یہ انقلاب ضرور رونما ہوا کہ ان کے دروازے پر ایک تختی آویزاں ہو گئی جس پر انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا: "پروفیسر مرزا شید اعلی بیگ" حالانکہ استاد انگریزی زبان سے قطعی نا آشنا تھے۔ مگر اب وہ

پروفیسر کہلانے پر نہ صرف فخر محسوس کرتے تھے بلکہ سختی سے اصرار بھی کرتے تھے۔ دو چار بار کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد گھر پر آنے والے شاگردوں نے ان کو پروفیسر کہنا شروع کر دیا تھا۔

انھوں نے اپنی برادری کے کشمیری بھانڈوں سے بھی تقریباً ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ عزیزداری اور قرابت داری کی ناجائز اولاد کی طرح پردہ پوشی کرتے تھے، لیکن انھوں نے محلہ نہ چھوڑا۔ اس کا سب سے بڑا سبب ان کا مکان تھا جو بقول ان کے بزرگوں کی یادگار تھا۔ اس بوسیدہ اور کھنڈر نما مکان کی وہ آئے دن مرمت کراتے رہتے۔ اس مرمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا مکان محلہ میں خاصا نمایاں نظر آنے لگا۔

آمدنی معقول تھی مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی مگر اب وہ اور بھی زیادہ وزنی گالیاں بکنے لگے تھے۔ شاگردوں کو بات بات پر کتوں کی طرح دھتکارتے اور شاگرد تھے کہ دم سادھے بیٹھے رہتے چوں تک نہ کرتے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جن سے میرے مراسم تھے۔ پوچھا، بھائی میرے یہ استاد شیدی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے کہ فیس بھی تگڑی دیتے ہو اور دھڑا دھڑ گالیاں بھی کھاتے ہو۔ کسی اور استاد سے موسیقی کی تعلیم کیوں نہیں حاصل کرتے۔ کم و بیش سب کا ایک ہی جواب ہوتا اور وہ یہ ہوتا کہ جس طرح سارنگی بجانے میں دور دور تک استاد شیدی کا جواب نہ تھا۔ اسی طرح وہ راگ داری کی ایک ایک رگ اور ایک ایک ریشے سے واقف تھے۔ فن موسیقی کے تمام اسرار و رموز ان پر منکشف تھے۔ اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ بتانے پر آتے تو یہ تک بتا دیتے کہ فلاں راگ کا موجد کون تھا کب نکلا کیسے نکلا اور اب تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

انھی دنوں کا ذکر ہے۔ راجہ بانکی پور نے اپنی قیصر باغ کی کوٹھی میں ایک تقریب منعقد کی۔ رقص و موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ دور دور سے طوائفیں آئی تھیں۔ کلاکار، موسیقار اور گویے بھی تھے۔ استاد شیدی کو بھی بلایا گیا، ہر چند کہ اب وہ موسیقی کی محفلوں اور مجروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے مگر منصور علی کے اصرار پر چلے گئے۔ راجہ صاحب نے نہایت دھوم دھام سے جشن کا انتظام کیا تھا۔

رات بھر راگ رنگ کی محفل گرم رہی۔

سر اور سنگیت کے وہ، وہ روپ دیکھنے میں آئے کہ اہل ذوق دل تھام کر رہ گئے مگر استاد شیدی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا۔ ہوا یہ کہ رات کے کوئی گیارہ بجے بدر منیر نے ایک دادرا گایا۔ بدر منیر کے عروج کا زمانہ تھا۔ قبول صورت طوائف تھی۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ، تیکھے نقش ونگار، سر قند آنکھوں میں جگ مگ کرتی ستاروں کی کہکشاں۔ اس نے دادرا چھیڑا تو محفل میں شعلے بھڑک اٹھے۔ بول تھے۔

اندھریا ہے رات، سجن رہیو کہ جیو۔

آدھی رات کا وقت۔ اودھ کے تعلق داروں کی محفل، بدر منیر نے کھڑے ہو کر نرت کے ساتھ دادرے کے بول ادا کیے تو وہ معجون شباب آور کا کام کر گیا۔ ہر چہار سمت سے واہ واہ سبحان اللہ ہونے لگی۔ روپیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ محفل میں راجہ صاحب اجے گڑھ بھی موجود تھے۔ اس زمانے میں بدر منیر ان کے پاس تھی۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے روپے نچھاور کیے۔

بدر منیر نے نرت ادا کرنے میں بانکی چتونوں کی ایک ایک گھات بدن کا ہر پیچ وخم روپ کی ہر چھب داؤ پر لگا دی۔ اہل محفل بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدلتے۔ بار بار راجہ اجے گڑھ کو چھیڑتے اور وہ بڑے فخر سے مسکرا مسکرا کر دیکھتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بدر منیر سے راز و نیاز کرتے۔ بغرضیکہ اس نے بزم طرب کو تلپٹ کر دیا۔

بدر منیر کا مجرا ختم ہوا تو محفل کا رنگ ایسا بدلا کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اس کے رخصت ہوتے ہی استاد شیدی اپنی سارنگی سنبھالے ہوئے نمودار ہوئے۔ وہ حسب معمول ڈھیلی ڈھالی اچکن اور دوپلی ٹوپی لگائے تھے۔ ان کی وضع قطع اور شکل وصورت دیکھ کر بعض منچلے بھڑکے مگر آداب مجلس کے پیش نظر صرف مسکرا کر رہ گئے۔ کسی کو پھبتی کسنے کی جرأت نہ ہوئی۔

استاد نے سارنگی پر راگ ایمن کلیان چھیڑا اور دھیرے دھیرے استائی میں چلے مگر محفل کا مطالبہ کچھ اور تھا۔ استاد کو اس کا اندازہ نہ تھا۔ وہ طبلے کی سنگت کے ساتھ مدھم سروں میں سارنگی بجاتے

رہے۔ کچھ دیر سکوت طاری رہا پھر سامعین کی دلچسپی بھٹکنے لگی۔ محفل پر اکتاہٹ اور بے زاری چھانے لگی سر جوالا پرشاد سریواستوا بھی موجود تھے غالباً مہمان خصوصی تھے۔ تقریب میں شرکت کے لیے خاص طور پر کانپور سے آئے تھے۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ زیر لب مسکرا کر بولے۔

"استاد جی! یہ کیا روں روں لگا رکھی ہے۔ اپنے فن کی کچھ بانگی دکھایئے"۔

استاد شیدی محفل کے رنگ ڈھنگ سے پہلے ہی بے زار تھے۔ سرجے۔ پی سریواستوا کے ٹوکنے پر ان کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ فوراً ہاتھ روک لیا۔ پلٹ کر طبلچی کی جانب دیکھا۔ ڈپٹ کر بولے۔ "روک لے ہاتھ"۔ طبلچی نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ انھوں نے خاموشی سے قریب رکھا ہوا غلاف اٹھایا اور سارنگی پر چڑھانے لگے۔ سرجے پی سریواستوا کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نرم لہجے میں بولے "معلوم ہوتا ہے استاد، آپ میری بات کا برا مان گئے۔ میں نے تو آپ سے ایک درخواست کی تھی"۔ وہ کھل کر مسکرائے "اب تو آپ کو کچھ سنا کر ہی جانا ہوگا"۔ راجہ بانکی پور نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

استاد نے جل کر کہا "اجی سنانے والے کی تو۔۔۔"۔ انھوں نے بھڑ سے گالی دی۔ بدستور سارنگی کو غلاف میں لپیٹتے رہے "آپ نے مجھے کوئی میراثی سمجھا ہے۔ برسوں خون پانی کر کے ریاض کیا ہے۔ رنڈیوں کے در پر جوتیاں سیدھی نہیں کی ہیں۔ واہ، صاحب واہ، کیا قدر دانی کی ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سالے ایسے بد ذوقوں سے سابقہ پڑے گا"۔ انھوں نے سارنگی بغل میں دبائی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

محفل پر سناٹا چھا گیا۔ سر جوالا پرشاد، ان دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ بالفاظ دیگر مرکزی وزیر کے منصب پر فائز تھے۔ خدشہ پیدا ہوا کہ استاد اگر جوتے مار کر محفل سے نکالے نہ گئے تو کم از کم جیل کی ہوا ضرور کھانی پڑے گی۔ انھوں نے سر محفل سرجے۔ پی سریواستوا کی بے عزتی کی تھی لیکن استاد بڑی بے نیازی سے آگے بڑھے اور ایک شان استغنا کے ساتھ محفل سے چلے گئے

سر جوالا پرشاد ذات کے کائستھ تھے۔ آداب مجلس کے ساتھ مزاج میں رکھ رکھاؤ اور بردباری بھی تھی۔ فن کے قدردان بھی تھے۔ استاد شیدی کی جلی کٹی سن کر بھی ان کی پیشانی پر شکن نہ آئی۔ بدستور

مسکراتے رہے۔ راجہ صاحب بانکی پور کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھے اور کسی نہ کسی طرح استاد کو منا کر محفل میں واپس لائے۔

اس دفعہ استاد نے بہار کا خیال چھیڑا اور کئی گھنٹے تک سارنگی پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ استاد کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں بند تھیں۔ جسم پتھر کی مانند ایک جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ صرف ہاتھ چل رہا تھا اور سارنگی سے سنگیت کی بارش ہو رہی تھی۔

پھاگن کی مدہ ماتی رات تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک رچی تھی۔ ہر طرف چاندنی چٹکی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ کچھ تو موسم کا اثر تھا اور کچھ یہ بھی تھا کہ استاد چوٹ کھا کر اپنے فن کا کمال دکھا رہے تھے۔ انھوں نے دادرے کی تندی ٹھمری کے نشے کی طرح اتار کر رکھ دی۔ وہ رنگ جمایا کہ بہار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ رات ڈھلتی گئی۔ استاد کا ہاتھ سارنگی پر چلتا رہا۔ سماں بندھ گیا۔ کلیاں چٹکنے لگیں۔ پھولوں کے تختے مہکنے لگے۔ چاندنی کی رنگت نکھر گئی۔ ہوا میں جھرنوں کی پائل بجنے لگی۔ محفل پر سکوت طاری ہو گیا۔ ہر شخص مبہوت تھا۔ بے خود تھا۔

استاد نے ہاتھ روکا تو وہ اکڑ کر رہ گیا تھا۔ واللہ عالم یہ واقعہ کہاں تک درست ہے۔ میں تو اس محفل میں شریک نہ تھا۔ البتہ اتنا ضرور دیکھا کہ استاد شیدی نے شاگردوں کو کچھ عرصے کے لیے موسیقی کی تعلیم دینا بند کر دی تھی۔ ان کا دایاں ہاتھ سفید پٹی میں جھولتا رہتا۔ روزانہ سویرے سویرے ایک مالشیا آتا اور ان کے ہاتھ کی دیر تک مالش کرتا رہتا۔

اس بات کو زمانہ ہو گیا۔ زندگی میں بہت سے تغیرات رونما ہوئے۔ استاد شیدی میں بھی تغیر پیدا ہوا اس کا انکشاف بالکل اچانک ہوا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ وہ اپنا ایک ٹیلی گرام پڑھوانے میرے پاس آئے۔ جب ان کے شاگرد موجود نہ ہوتے تو وہ اس قسم کی خدمات اکثر مجھ سے لیا کرتے تھے۔ اس وقت میرے ایک دوست بھی موجود تھے۔ میں نے استاد کا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"آپ سے ملیے۔ آپ استاد شیدی ہیں میوزک کالج میں موسیقی کی تعلیم دیتے ہیں۔ سارنگی بجانے

میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

میں نے تعارف کرانے میں حتی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلے کہ استاد کی طبع نازک پر گراں گزرے۔ مگر غلطی سرزد ہو گئی۔ اس کا اندازہ مجھے استاد کی آنکھوں میں اُمڈتی ہوئی جھنجلاہٹ سے ہوا۔ انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے قہر آلود نظروں سے کچھ اس طرح دیکھا کہ اگر کوئی شاگرد ہوتا تو منہ پر زناٹے کا وہ جھانپڑ پڑتا کہ دن میں تارے نظر آ جاتے میں چونکہ ان کے شاگرد ہونے کی سعادت سے محروم تھا لہٰذا انھوں نے صرف نگاہ عتاب پر اکتفا کیا۔ میرے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے غلطی کی اس طرح اصلاح کی۔

"جناب۔ مجھ کو پرنس مرزا شیدا علی گورگانی کہتے ہیں۔ میوزک کالج میں پروفیسر ہوں۔ مگر یہ میرا خاندانی پیشہ نہیں۔"

اس کے بعد استاد نے اپنا شجرہ نسب بیان کرنا شروع کیا تو سلاطین مغلیہ سے اپنا رشتہ ملا دیا۔ دیر تک اس بات پر زور دیتے رہے کہ وہ آل تیمور سے ہیں اور کھرے مغل ہیں۔ موسیقی جو عام طور پر ان کی گفتگو کا موضوع ہوتی تھی۔ اس کے بارے میں انھوں نے ایک لفظ نہ کہا۔

استاد رخصت ہوئے تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سوچتا رہا کہ اس دفعہ استاد نے بڑی اونچی زقند لگائی۔ آج تک انھوں نے اشارتاً اپنے آل تیمور ہونے کا اظہار نہ کیا تھا۔ یہ اچانک ان پر اپنے مغل شہزادہ ہونے کا انکشاف کیسے ہوا؟ تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ یہ دور کی کوڑی منصور علی ڈھونڈ کر لائے تھے۔ وہ بھی خیر سے اب ٹیوشن کے دھندے پر لگ گئے تھے۔ ان دنوں کسی کی عوضی پر میوزک کالج میں موسیقی کی تعلیم بھی دے رہے تھے۔

حقیقت حال کچھ اس طرح سننے میں آئی کہ کالج میں ایک روز کسی گوّیے نے منصور علی کو بھانڈ کہہ کر طعنہ دیا اور خود کو نواب واجد علی شاہ کا پڑپوتا بتایا۔ اس وقت تو بات تو تکار تک پہنچ کر ختم ہو گئی۔ مگر منصور علی نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ منصور اس گوّیے سے

سبقت لے گیا۔ ایک ڈگری اور اونچا گیا یعنی مغل شہزادہ بن گیا۔

استاد نے بیٹے کی ہرزہ سرائی کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے باقاعدہ تبلیغ بھی شروع کر دی۔ ان کے مکان کی تختی بھی بدل گئی۔ نئی تختی پر لکھا تھا: "پرنس مرزا شیدا علی بیگ گورگانی" مگر اتنی بڑی تبدیلی کو کشمیری بھانڈوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ استاد کے خلاف بھانڈوں کا باقاعدہ محاذ قائم ہو گیا۔ اس محاذ میں محلّے کے ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو بھانڈوں کی برادری سے تعلق نہ رکھتے تھے۔

جن دنوں یہ کش مکش زوروں پر تھی، میں لکھنؤ چھوڑ کر کراچی آ گیا اور زندگی کے جھمیلوں میں ایسا پھنسا کہ آج تک لکھنؤ جانا نصیب نہ ہوا۔ موسیقی سے مجھے کبھی نہ زیادہ لگاؤ تھا اور نہ اب ہے چنانچہ استاد شیدی بھی کبھی یاد نہ آئے۔

(۴)

کئی سال قبل کا ذکر ہے۔ میں ایک عزیز سے ملنے ملیر گیا۔ واپسی پر بس کے انتظار میں بس اسٹینڈ پر کھڑا تھا کہ کسی نے قریب آ کر خالص لکھنوی انداز میں جھک کر سلام کیا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ جھٹ پٹے میں اس شخص کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ البتہ اتنا خیال ضرور آیا کہ اسے کہیں دیکھا ہے اور کس جگہ دیکھا ہے۔ یہ مطلق یاد نہ آیا۔ اسی اثنا میں اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"نہیں پہچانا"، اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی "ہاں بھئی غریبوں کو کون پہچانتا ہے۔ یہ تو سالی اس سرزمین کی خاصیت ہے۔"

میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ استاد شیدی تھے۔ ابھی خیر و عافیت پوچھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ بس آ گئی۔ میں آگے بڑھا اور جھپاک سے بس میں سوار ہو گیا۔ اس وقت تھا بھی عجلت میں۔ استاد سے یہ بھی پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ ان کا قیام کہاں تھا اور کب تک کراچی میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عارضی طور پر آئے تھے یا مستقل سکونت اختیار کر لی تھی؟

لیکن اس سرسری ملاقات سے میں نے یہ اندازہ ضرور لگالیا تھا کہ ان کی حالت بہت پتلی تھی۔ اچکن بھی میلی کچیلی پہنے ہوئے تھے۔ چہرہ بجھا بجھا تھا۔ آواز میں بھی وہ کرارہ پن نہ تھا۔ جسے سن کر سینکڑوں کے ہجوم میں ان کو پہچانا جاسکتا تھا۔

لگ بھگ ہفتے بھر بعد ان سے پھر سرِراہے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس دفعہ خاصی تفصیلی ملاقات رہی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کراچی آئے ہوئے سات آٹھ ماہ کا عرصہ ہوچکا تھا۔ دونوں لڑکیوں کی شادی انھوں نے لکھنؤ ہی میں کردی تھی۔ بیوی کے علاوہ صرف چھوٹی لڑکی کراچی میں ان کے ساتھ تھی۔ میوزک کالج کی ملازمت ہندو پرنسپل کی جن سنگھی ذہنیت کے باعث جاتی رہی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہولی کے تہوار پر پرنسپل نے کالج کے تمام اساتذہ کو اپنے گھر مدعو کیا۔ استاد شیدی نے ٹالنا چاہا۔ عذر بھی پیش کیا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ سر ہوگیا۔ مجبوراً استاد شیدی کو بھی دوسرے اساتذہ کے ساتھ جانا پڑا۔

پرنسپل کی کوٹھی پر پہنچے۔ دیکھا، وہاں ہاؤ ہو کا بازار گرم تھا۔ ہر طرف رنگ کی پچکاریاں چلتی تھیں۔ ابیر اور گلال اڑتا تھا۔ ہولیارے بھنگ اور دارو چڑھائے رنگ کھیلتے تھے۔ مجیرے بجاتے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گاتے تھے۔

کہے سُنے کا بُرا نہ مانو، آج ہماری ہولی ہے۔

رنگ ابیر لے، لے کر، آئی ہماری ٹولی ہے۔

ہولی ہے بھئی ہولی ہے۔

ہولی ہے بھئی ہولی ہے۔

استاد شیدی نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو بہت چکرائے۔ اسی اثنا میں پرنسپل ایک طرف سے نمودار ہوا۔ عالم یہ تھا کہ نشے سے جھومتا تھا۔ آنکھیں چڑھی تھیں۔ چہرے پر لال لال گلال ملا تھا۔ طرح طرح کے رنگوں سے لباس شرابور تھا۔ ہاتھ میں رنگ بھری پچکاری تھی۔

۔ اس نے رنگ ڈالنے کے لیے پچکاری اٹھائی۔ استاد نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کی: "جناب مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ میں ہولی کھیل کر خود کو جہنمی بنانا نہیں چاہتا۔"

پرنسپل ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ بے نیازی سے بولا: "اماں چھوڑو استاد کیا رکھا ہے۔ اس نرک اور سورگ کے چکر میں۔"

استاد سیدھے، سچے مسلمان تھے۔ مصلحت اندیشی کے گُر سے ناواقف تھے۔ منہ پھٹ بھی تھے۔ بگڑ کر بولے: "واہ صاحب، یہ بھی خوب رہی۔ آپ کو کیا پتہ۔ جسم پر جہاں جہاں ہولی کا رنگ پڑے گا۔ وہ حصہ جہنم کی آگ میں جلے گا۔ مجھے تو اس شیطانی چرخے سے باز ہی رکھیے۔ میں ہرگز ہرگز رنگ نہیں ڈلواؤں گا۔"

ان کے اس رویے سے پرنسپل کے مذہبی جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی۔ تلملا کر رہ گیا مگر خاموش رہا۔ بعد میں استاد رشیدی کے خلاف اس نے درپردہ کاٹ پیچ شروع کر دی۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالج کو خیرباد کہنا پڑا۔

ملازمت سے علیحدگی کے باوجود ان کے حالات برے نہ تھے۔ شاگرد حسبِ معمول آتے رہے۔ استاد انھیں فنِ موسیقی کی تعلیم دیتے رہے۔ کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو رہی تھی مگر فرقہ وارانہ فسادات کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا۔ مسلمان کچھ تو فسادات کے ڈر سے اور کچھ معاشی پریشانیوں کے باعث قسمت آزمائی کے لیے دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے۔ ایک روز منصور علی بھی پاکستان چلا گیا۔ اس کی تحریک پر استاد رشیدی بھی پاکستان آ گئے۔

میں نے پوچھا: "منصور کہاں ہے؟"

جل کر بولے: "آج کل ملتان میں ہے۔ اس نے قوالوں کی چوکی بنالی ہے۔"

"قوالوں کی چوکی؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

اس دفعہ وہ مسکرائے: "آخر کچھ نہ کچھ تو پیٹ پالنے کا دھندا کرتا۔ یہاں گانے بجانے کی بھائی

کون قدر کرتا ہے۔"

"اور آپ؟" میں غیرارادی طور پر پوچھ بیٹھا۔

یکایک پرانے استاد شیدی جاگ اٹھے۔ انھوں نے ایک عدد سڑی ہوئی گالی دی جھنجلا کر بولے۔ "اجی قوالی بھی کوئی راگ یا سنگیت ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ منصور میرے سر ہبت ہوا۔ میں نے کہا، ابے بیدھا ہوا ہے گھاس تو نہیں کھا گیا۔ اب میں تالیاں پٹخار کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر الٹی سیدھی تانیں لگاؤں گا۔ قوالی گاؤں گا۔ ذرا غور تو کیجیے۔ زندگی بھر کا ریاض چند ٹکوں کی خاطر قربان کردوں۔ واہ صاحب، یہ بھی ایک ہی۔"

وہ دیر تک ایسی ہی باتیں کرتے رہے مگر ان کی حالت بہت خستہ تھی۔ اچکن بوسیدہ ہو کر جگہ جگہ سے مسک گئی تھی۔ پائجامہ پر گھٹنے کے پاس پیوند لگا تھا۔ چہرہ جھلس کر زیادہ سیاہ اور بدوضع ہو گیا تھا۔

دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہو گئے۔

چند روز گزرے تھے کہ وہ میرے دفتر آئے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر باتیں کرنے کے بعد انھوں نے ریڈیو پاکستان کے ایک بڑے افسر کا نام لیا۔ پوچھا، "آپ کی ان سے کچھ یاد اللہ ہے۔ ریڈیو سے لگ جاؤں گا تو دال روٹی کا کچھ بیتا ہو جائے گا۔"

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "میری تو ان سے کوئی شناسائی نہیں۔ کبھی ملنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔"

میرا جواب سن کر ان کا چہرہ اتر گیا۔ نہ جانے وہ میرے پاس کتنی توقعات لے کر آئے تھے۔ دل گرفتہ ہو کر بولے۔ "یہاں بھی قسمت جُل دے گئی۔ سوچا تھا، شاید آپ کے وسیلے سے ان تک رسائی ہو جائے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بغیر سفارش کے یہاں کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔"

ان کی باتیں سن کر میں نے غور کیا۔ استاد شیدی کو زندگی برتنے کا اب تک گر نہ آیا۔ وہ ہمیشہ اپنے فن کی گہرائیوں میں اس قدر ڈوبے رہے کہ کبھی جھانک کر بھی زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش نہ کی۔ میری سفید پوشی سے خواہ مخواہ مرعوب ہو گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ سفارش ایک ہاتھ سے دینے اور

دوسرے ہاتھ سے وصول کرنے کا کاروبار ہے اور اس لین دین کے کاروبار میں کسی طور میں فریق بننے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر سے ایک محفل میں ملاقات ہو گئی۔ ان سے کچھ یاد اللہ بھی تھی۔ میں نے ان سے استاد شیدی کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے حتی الوسع مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ کچھ عرصہ بعد استاد شیدی میرے پاس آئے تو فوراً ان کے پاس بھیجا۔ استاد ان سے مل کر آئے تو کسی قدر مطمئن نظر آتے تھے۔

میں نے دریافت کیا: "کہیئے استاد، کچھ کام بنا؟"

مسکرا کر بولے: "پرسوں آڈیشن کے لیے بلایا ہے۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "وقت جم کچھ نہ دکھائے تھوڑا ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ میں میوزک کالج میں پروفیسر تھا۔ راگ راگنیاں سکھاتا تھا۔ پڑھاتا تھا۔ امتحان لیتا تھا۔ کیا خبر تھی کہ تقدیر یہ دن بھی دکھائے گی کہ مجھے بھی مبتدیوں کی طرح امتحان دینا پڑے گا۔" استاد شیدی نے قدرے تامل کیا: "آڈیشن ایک طرح کا امتحان ہی تو ہوتا ہے نا؟"

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا: "تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

بجھے ہوئے لہجہ میں بولے: "جاؤں گا۔ جھک مار کر جاؤں گا۔ پیٹ پالنے کی شاید کوئی صورت نکل آئے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ہم پہ ایسی بھی پڑے گی ہمیں معلوم نہ تھا۔"

استاد چلے گئے۔ چند روز بعد دفتر آئے تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کام نہیں بنا۔ خدشہ غلط نہ نکلا۔ دریافت کیا: "استاد، آڈیشن کا کیا نتیجہ نکلا؟"

کہنے لگے: "پروڈیوسر صاحب، اس دفعہ بھی تپاک سے ملے۔ آڈیشن کے لیے اسٹوڈیو میں لے گئے۔ ایک گانے والی وہاں پہلے ہی موجود تھی۔ خوب بن ٹھن کر آئی تھی۔ سن بھی زیادہ نہ تھا۔ صورت شکل بھی اچھی تھی۔ اسے ایک ٹھمری گانا تھی اور مجھے سارنگی پر اس کے ساتھ سنگت دینا تھی۔ آڈیشن

شروع ہوا۔ اس نے ٹھمری چھیڑی۔ نہایت بے سری گانے والی تھی۔ سر تال کا کچھ پتہ نہ تھا۔ بس صورت ہی صورت تھی۔"

"تب تو آپ کے لیے مشکل پیدا ہوئی ہوگی"۔ میں نے اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔

بولے۔"اجی میرے لئے کیا مشکل و شکل پیدا ہوتی۔ زندگی میں ایسی بے سری گانے والیوں سے پہلے بھی سابقہ پڑ چکا ہے مگر اس آڈیشن میں ایک ایسی واردات پیش آئی کہ میں آپ سے کیا عرض کروں"۔

میں نے بے چین ہو کر کہا۔" وہ کیا؟"

"ٹھمری کے بارے میں تو آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ اس میں گوپیوں کے ساتھ کرشن کنھیا کی چھیڑ چھاڑ کا ذکر ہوتا ہے"۔ (مجھے ٹھمری کے متعلق کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوتی ہے اور کیسے گائی جاتی ہے مگر میں خاموش رہا۔ استاد بتاتے رہے)"یہ مشہور ٹھمری تو آپ نے ضرور سنی ہوگی۔ بیاں نہ مروڑو شام مراری! لیکن صاحب، اس گانے والی نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے ٹھمری کا جو بول چھیڑا، وہ یہ تھا۔ بیاں نہ مروڑو عبدالباری۔ میں اسے سن کر چونکا۔ سوچا، شاید میری سماعت میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی۔ انگلی ڈال کر کان کو کریدا مگر وہ برابر عبدالباری، عبدالباری کی رٹ لگا رہی تھی۔"

حیرت زدہ ہو کر میں نے پوچھا:" استاد، واقعی ایسا ہوا؟"

"اجی، میں آپ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ بالکل یہی ہوا"۔ استاد نے مجھے یقین دلایا۔"بار بار شام مراری کے بجائے عبدالباری سنا تو میں بہت چکرایا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ پروڈیوسر صاحب سے جھجکتے ہوئے پوچھا: حضور! یہ عبدالباری کون بزرگوار ہیں؟ جانتے ہیں آپ انھوں نے کیا جواب دیا۔ ہنس کر بولے۔ دیکھیے استاد، پاکستان اسلامی ملک ہے۔ یہاں ہندوؤں کا شام مراری نہیں چل سکتا۔ یہاں تو ٹھمری میں عبدالباری ہی چلے گا۔ شام مراری کو اب بھول جائیے۔"

"آپ نے یہ سن کر کیا جواب دیا؟"

"جواب کیا دیتا۔ خاموشی سے سارنگی پر غلاف چڑھایا۔ ہاتھ باندھ کر پروڈیوسر صاحب

سے عرض کیا۔ سرکار! میں آپ کے عبد البار ی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اٹھا اور اسٹوڈیو سے باہر آگیا۔" استاد رشیدی کا لہجہ اچانک تیکھا ہوگیا۔" ارے صاحب۔ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں مگر راگ تو راگ ہی ہوتا ہے۔ ذرا غور تو کیجیے ٹھمری ایسے مشہور اور مقبول راگ کو اس طرح مشرف بہ اسلام کیا کہ سالے کا بالکل حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ واللہ، ایسا خون کھولا کہ جی چاہا اپنا سر پھوڑ لوں۔ بھئی واہ، واہ! کیا سنگیت کی درگت بنائی۔ ایسی کی تیسی کر کے رکھ دی۔ ٹھمری کی ماں۔۔۔" انھوں نے بھڑ سے گالی دی۔

وہ جھنجلاہٹ میں ابھی نہ جانے اور کیا کیا کہتے۔ میں نے فوراً مداخلت کی:" استاد یہ تو بہت بُرا ہوا۔" دبی زبان سے احتجاج بھی کیا" مصلحت کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ کو اس طرح اُٹھ کر آنا نہیں چاہیے تھا۔"

"اجی، چھوڑیئے۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے کیسی مصلحت اور کہاں کی مصلحت"۔ استاد رشیدی ایک دم بھڑک اٹھے۔" تف ہے ایسی روزی پر۔ میں تو اب وہاں کھڑے ہو کر پیشاب بھی کرنے کا نہیں۔"

میں نے ان کو اس قدر طیش کے عالم میں دیکھا تو بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا" منصور کا کیا حال احوال ہے؟"

" اس کا خط آیا ہے۔ وہ بھی آج کل پریشان ہے۔ لکھا ہے کہ گلا خراب ہوگیا۔ کسی نے پان میں سنیدور کھلا دیا۔" دفعتاً ان کا لہجہ تلخ ہوگیا"۔ اجی سنیدور و نیدور کسی نے کیا کھلایا ہوگا۔ سالے نے قوالیاں گا، گا کر اپنی آواز کا ستیاناس کر لیا۔"

میں خاموش رہا۔ استاد نے بھی مزید بات چیت نہ کی۔ وہ چلے گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگئے۔ مجھے ایک طرف لے گئے۔ چند لمحے چپ چاپ کھڑے رہے پھر جھجکتے ہوئے بولے:" کچھ روپے ہوں گے آپ کے پاس۔ بخدا دو روز سے گھر میں فاقہ ہے۔" یہ بتا کر وہ اس طرح سہمے ہوئے نظر آئے۔ جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔

میرے پاس اس وقت صرف ایک روپیہ تھا۔ دو روپے دفتر کے ایک رفیق کار سے قرض لیے اور تینوں روپے استاد کو دے دیے۔ انھیں گھر کا پتہ بھی بتا دیا۔ کہا وہاں آجائیں تو کچھ اور بندوبست بھی کر دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا حال زار سن کر کلیجہ دھک سے ہو گیا تھا۔

دوسرے ہی روز وہ گھر پر آئے۔ میں نے دس روپے دیے۔ انھوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹ پکڑا۔ لمحہ بھر بت بنے کھڑے رہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر اس طرح دھاڑیں مار کر روئے جیسے کوئی اپنے عزیز کی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر روتا ہے۔

ایک عرصہ تک وہ نظر نہ آئے۔ میں نے سوچا کہیں کام کاج مل گیا ہو گا مگر جب وہ ملے تو ان کی حالت اور بھی زیادہ خستہ تھی۔ اچکن میلی چیکٹ ہو گئی تھی۔ ان کی موٹی ناک پچک گئی تھی۔ جنگلی کبوتر کی سی سرخ سرخ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ اس بار وہ صرف یہ عرض لے کر آئے تھے کہ میں انھیں کہیں چھوٹی موٹی ملازمت دلوا دوں۔ اس روز بھی میں نے ان کو کچھ رقم دی۔ وعدہ کیا کہ کہیں نوکری دلوا دوں گا۔

وہ برابر آتے رہے اور میں ہر بار وعدہ کرتا رہا۔ وہ میرے وعدے پر یقین کر کے چلے جاتے۔ اپنی عبرتناک حالت کی المناک داستان بھی سنا جاتے۔ آخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ میں ان سے بیزار ہو گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں ہر بار ان کی مالی امداد کرنے سے معذور تھا۔

ایک دن وہ آئے تو میں نے کہلوا دیا کہ "گھر پر نہیں ہیں"۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ واپس جانے کے بجائے وہ دروازے پر ٹھیر گئے اور ٹہل ٹہل کر میرا انتظار کرتے رہے۔ عجب مصیبت تھی۔ میں گھر کے اندر قید تھا اور وہ دروازے کے سامنے گویا پہرہ دے رہے تھے۔ شاید وہ دن کے نو بجے آئے تھے۔ سہ پہر تک مسلسل ٹہلتے رہے۔ مجھے ان کی حالت پر ترس آگیا۔ خدا معلوم کیا افتاد پڑی تھی کہ صبح کے بھوکے پیاسے وہ اس طرح بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

مشکل یہ تھی کہ گھر کا ایک ہی دروازہ تھا جس پر وہ موجود تھے۔ ورنہ میں کسی نہ کسی طرح ان کے

پاس ضرور جاتا بہر حال جب تک وہ موجود تھے۔ بڑا ذہنی کرب رہا۔ جھٹ پٹا ہونے سے کچھ دیر قبل وہ چلے گئے۔ اس وقت وہ بیماروں کی طرح نڈھال اور لاغر نظر آرہے تھے۔ مگر اس روز کے بعد وہ دوبارہ میرے گھر نہ آئے۔ ایک مدت گزر گئی۔ خدا جانے کس حال میں تھے۔

(۵)

چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ میں ایک رشتہ دار کے لیے رائیڈنگ شوز تیار کرانے کی غرض سے لارنس روڈ کی شو مارکیٹ گیا۔ جوتے بنانے والے ایک کارخانے میں داخل ہوا تو مجھے ایک شخص پر استاد شیدی کی شباہت کا گمان ہوا۔ وہ فرش پر بیٹھا، رانپی سے بڑی محویت کے عالم میں چمڑا کاٹ رہا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اس کے بدن پر صرف ایک گندہ جانگیہ تھا۔ دبلا پتلا اتنا تھا کہ ایک ایک ہڈی نظر آتی تھی۔

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہ استاد شیدی ہی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ استاد نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بہت خفیف ہوں گے۔ انھیں ٹھیس پہنچے گی۔ میں واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ خلاف توقع بڑی گرم جوشی سے بولے۔

"ارے آپ ہیں خیریت تو ہے۔"

انھوں نے جھٹ باہر والے کو آواز دی۔ وہ آیا دو چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی تو اصرار کر کے بڑے چاؤ سے پلائی۔ میں نے اظہار ہمدردی کے طور پر کہا۔

"مرزا صاحب، یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

ہنس کر بولے "بھائی دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی ہے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

میں نے دریافت کیا "تو گویا آپ نے موسیقی کو بالکل ترک کر دیا؟"

بہ نہایت بے نیازی سے بولے "اجی لعنت بھیجئے سالی موسیقی کو۔"

"آپ نے برسوں خون پسینہ کر کے ریاضت کی ہے اور اپنے فن میں کمال حاصل کیا ہے۔"

میں نے انھیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"اجی کیا رکھا ہے ان باتوں میں" وہ دل گرفتہ ہو کر بولے"۔ نہ جانے کیسے سر میں پرنس بننے کا خنّاس سمایا"۔ ان کا چہرہ بجھ گیا"۔ اسی چکر میں مارا گیا"۔

"ایسا کیا بھی، تب بھی آپ نے کوئی جرم تو نہیں کیا" میں نے ان کی دل جوئی کی "ٹھاکر اونکار ناتھ بھی تو آپ ہی کی طرح کے بڑے گانے بجانے والوں میں سے ہیں جن کی عزّت افزائی کے طور پر انھیں پرنس نہیں سمراٹ کہا جاتا ہے۔"

"اجی ہندوستان کی باتیں ہندوستان میں رہ گئیں۔ ایسے ہی بڑے نامی گرامی استادوں کی دیکھا دیکھی میرے سر میں بھی پھوڑا نکلا۔ اتنی اونچائی تک پہنچنے کی کوشش کی کہ دھڑام سے منہ کے بل گرا"۔ اپنی بات کہتے کہتے وہ مسکرائے"۔ میاں! سچ پوچھیے تو اپنی اوقات بھول گیا تھا۔ میں ڈھپالی تھا، ڈھپالی ہی رہا۔ پہلے ساز اور سُر کے لیے طبلوں پر کھال منڈھتا تھا۔ اب پیروں کے لیے لکڑی کے فرموں پر چمڑا منڈھتا ہوں۔ بات تو ایک ہی ہے نا۔"

میں نے کرید کر پوچھا"۔ مگر سارنگی سے تو کبھی کبھار شوق پورا کرتے ہی ہوں گے؟"

چمک کر بولے"۔ اجی کیسی سارنگی، کہاں کی سارنگی۔ جب جوتوں کے تلے بھی جواب دے گئے اور گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہ رہا تو ایک روز سارنگی کو اونے پونے بیچ کر ایک جوڑی جوتے کی خریدی۔ سارنگی بیکار ہی تو پڑی تھی"۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی"۔ آپ خود غور کیجیے۔ ساز اور سر کے بغیر دنیا کے کون سے کام بند ہوتے ہیں مگر پیر میں جوتے کے بغیر گزارہ نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

میں نے غور کیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ استاد شیدی سال ہا سال تک فن موسیقی کے اسرار و رموز سیکھتے اور سکھاتے رہے۔ اب وہ زندگی کے اسرار و رموز بھی سیکھ گئے تھے۔

خفیہ ہاتھ

دن ڈھلے علیم الدین سبزواری نے ایک بار پھر فون کیا۔ اس دفعہ داد محمد سومرو کی کوٹھی سے مینجر کے بجائے کوئی اور بول رہا تھا۔ یہ سومرو کا پرائیویٹ سیکرٹری علی بخش ناریجو تھا۔

علیم الدین نے دریافت کیا: "مسٹر سومرو تشریف رکھتے ہیں؟"

جواب ملا: "جی نہیں، وہ یہاں سے چلے گئے۔"

"کوئی حرج نہ ہو تو زحمت کر کے یہ بھی بتا دیجئے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"سائیں! میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" ناریجو نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میں اخبار 'ندائے وطن' کا ایڈیٹر علیم الدین سبزواری بول رہا ہوں۔"

"آپ سومرو صاحب سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ ضروری کام ہے۔ جس کی اہمیت کا ان کو بھی بخوبی علم ہے۔" علیم الدین نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ملاقات کے لیے مجھ سے شام کا وقت بھی مقرر کیا تھا۔ حیرت ہے انھوں نے نہ میرا انتظار کیا، نہ اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ ہو سکتا ہے، کسی بہت ضروری کام سے اچانک جانا پڑا ہو۔ مگر مجھے فون تو کر دیتے۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "کہاں گئے ہیں؟"

"سندر ولی گئے ہیں۔ سمر لاج میں ٹھیریں گے۔" پرائیویٹ سکرٹری نے جھجکتے ہوئے بتایا۔" مگر وہ صرف رات بھر وہاں رہیں گے۔"

"کل شام تک تو یہاں واپس آجائیں گے نا؟" علیم الدین نے قیاس آرائی کی۔

"جی نہیں۔" سیکرٹری نے اس کی توقعات خاک میں ملادیں۔" فوری طور پر ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ سندر ولی سے وہ ایک شادی میں شرکت کرنے ٹنڈو الہ یار چلے جائیں گے۔"

"تو گویا، ان کی واپسی کی فی الحال کوئی توقع نہیں۔"

"جی ہاں، کوئی امید نہیں۔" سیکرٹری نے علیم کو یقین دلایا۔" میں ڈائری دیکھ کر ان کا پروگرام بتارہا ہوں۔"

علیم الدین سبزواری نے پرائیویٹ سیکرٹری کا شکریہ ادا کیا اور ریسیور اٹھا کر رکھ دیا۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ داد محمد سومرو سے کیوں کر ملا جائے۔ ملنا نہایت ضروری تھا۔ علیم الدین نے کچھ سوچ کر ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کو فون کیا۔ اس کا مالک علیم کا پرانا واقف کار تھا۔ اس نے علیم کی رہنمائی کی اور جو معلومات فراہم کیں۔ ان کے مطابق موٹر روڈ سے سندر ولی تک ۴۲ میل کا فاصلہ تھا۔ بسیں اور لاریاں صرف عالمگیری تک جاتی تھیں۔ وہاں سے سندر ولی ۱۵ میل دور تھا۔ کچھ فاصلے تک نیم پختہ سڑک تھی۔ آگے کچا راستہ تھا۔ جس پر جگہ جگہ گڑھے تھے۔ راہ میں آبادی برائے نام تھی۔ ویران اور بنجر علاقہ تھا۔ علیم الدین نے ساری اطلاعات نوٹ کرلیں۔

آدھ گھنٹہ کے اندر، اندر وہ سفر کے لیے تیار ہوچکا تھا۔ اس نے جیپ نکالی۔ پٹرول پمپ پہنچ کر جیپ کی ٹنکی پوری طرح بھروائی اور اللہ کا نام لے کر چل کھڑا ہوا۔ شہر سے نکل کر وہ نیشنل ہائی وے پر چند ہی میل دور گیا ہوگا کہ شام ہوگئی۔ ہر طرف دھندلکا پھیل گیا۔ سڑک کی پچھلے دنوں مرمت ہوئی تھی۔ ٹریفک بھی کم تھا۔ راستہ بہت اچھا تھا۔ اس نے جیپ کی رفتار تیز کردی اور اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر مستعدی سے بیٹھ گیا۔

جب وہ عالمگیری پہنچا تو رات کے آٹھ بجے کا عمل تھا۔ یہ مختصر سی مضافاتی بستی تھی۔ سڑک کے

دونوں جانب پیلی مٹی کی دیواروں کے کچے مکانات تھے، جن پر کھجور کے پتوں کی چھتیں تھیں۔ بازار کی رونق اجڑ چکی تھی۔ صرف لاریوں کے اڈے پر چند دکانیں ابھی تک کھلی تھیں۔ ان میں ایک چائے خانہ بھی تھا۔ جس میں نہایت اونچی آواز سے فلمی گانوں کے ریکارڈ بج رہے تھے۔

علیم نے جیپ ایک جانب ٹھیرائی۔ نیچے اترا اور چائے خانے کے اندر چلا گیا۔ چائے خانہ زیادہ کشادہ نہ تھا۔ ہر طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ چائے خانے میں ایک پٹرومیکس روشن تھا۔ اس کی تیز روشنی میں بھدی اور گندی میزوں کے اردگرد ٹین کی بوسیدہ کرسیاں پڑی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا تھے۔ گرم گرم چائے کے گھونٹ بھر رہے تھے اور فلمی گانے سن رہے تھے۔

علیم نے چائے خانے کے ماحول پر کوئی توجہ نہ دی۔ سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا۔ ایک چائے منگوائی۔ چائے آئی تو اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گرم گرم پیالی ختم کی۔ چائے کا ذائقہ کسیلا تھا۔ ضرورت سے زیادہ میٹھی بھی تھی۔ شکر کے ساتھ اس میں گڑ کی بھی آمیزش تھی۔ چائے خانے سے باہر نکل کر اس نے سگریٹ سلگائی اور جیپ سے ٹیک لگا کر کش لگانے لگا۔ جیپ کے اندر کئی گھنٹے تک مسلسل بیٹھے رہنے سے اس کی ٹانگوں اور کمر کے جوڑ دکھنے لگے تھے۔ ہڈیوں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔

جب تکان ذرا کم ہوئی اور جسم میں تازگی پیدا ہوئی تو وہ جیپ کے اندر گیا۔ اسٹیرنگ وہیل سنبھالا انجن اسٹارٹ کیا۔ گیئر بدلا۔ ایکسیلیٹر دبایا۔ جیپ آگے بڑھی۔ مڑی اور اس سڑک پر دوڑنے لگی جو سندلی جاتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عالمگیری کے لاری اسٹینڈ کی دکانوں کی روشنیاں آنکھیں جھپکا جھپکا کر دھندلی پڑ گئیں۔ عالمگیری کی بستی پیچھے رہ گئی۔ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دونوں جانب اونچے نیچے ٹیلے تھے، جو تاریکی میں ڈوبے ہولناک نظر آ رہے تھے۔ جیپ ان کے درمیان سے شور مچاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ علیم اپنی نشست پر بیٹھا شکار پر جھپٹنے والے چیتے کی سی تیز نظروں سے جیپ کی روشنی میں سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ اب سمندر کی جانب سے آنے والی تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھینگوں اور مچھلیوں کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ چٹانوں سے ٹکراتی

ہوئی شوریدہ سر لہروں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔

ویران سڑک پر اکا دکا راہگیر نظر آ رہے تھے۔ یہ گھروں کو لوٹنے والے مچھیرے تھے۔ ان کی بستی امیر گوٹھ، ٹیلوں کے اس پار نشیب میں واقع تھی۔ علیم لگ بھگ دس میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اب نیم پختہ سڑک ختم ہو چکی تھی جیپ کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ راستہ ناہموار تھا جگہ جگہ گڑھے تھے۔ جیپ بار بار ہچکولے کھاتی ڈگمگاتی اور ادھر ادھر جھک جاتی۔

علیم الدین بسنبھل کر جیپ دوڑا رہا تھا۔ ہوا بھری ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ یکایک بوندا باندی شروع ہو گئی علیم نے جیپ کی رفتار اور کم کر دی۔ سامنے شیشے پر وائپر تیزی سے گردش کر رہے تھے مگر راستہ ٹھیک سے سجھائی نہ دیتا تھا۔ اندھیرا بھی گہرا ہو گیا تھا۔ راستہ بالکل سنسان تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ احتیاط کے باوجود بائیں جانب کا اگلا پہیہ ایک گڑھے میں کچھ اس بری طرح اترا کہ جیپ زور سے اچھلی اور الٹتے الٹتے رہ گئی۔ علیم الدین سراسیمہ ہو گیا۔ خوف سے آنکھیں بند ہو گئیں۔ پہلی بار وہ اپنی غیر دانشمندی پر پچھتایا۔ اتنی رات گئے ایسے خراب راستے پر اسے جیپ سے سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کرتا بھی کیا۔ داد محمد سومرو سے فوری طور پر ملنا اس کے لیے نہ صرف ضروری بلکہ بہت ضروری تھا۔

خدا خدا کر کے جیپ سندر رولی پہنچی۔ سڑک کے ایک طرف لکڑی کا نہایت بوسیدہ بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر دھندلے، دھندلے حروف میں سندر رولی لکھا تھا۔ بورڈ سے فرلانگ، ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر بستی کے کچے مکانات اندھیرے میں پرچھائیوں کی مانند نظر آتے تھے۔ مکانوں میں کہیں کہیں چراغوں کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ جگہ پر فضا تھی۔ ہر طرف درختوں کے جھنڈ تھے جھاڑیاں تھیں۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

سمرلاج کی روشنی دور ہی سے نظر آتی تھی۔ یہ سرخ پتھروں سے بنی ہوئی قدیم وضع کی دو منزلہ حویلی تھی اور راستے سے ہٹ کر ایک سیاہ چٹان کے دامن میں واقع تھی۔ علیم نے جیپ موڑی اور ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر انجن بند کیا۔ کنجی احتیاط سے جیب میں رکھی جیپ سے نیچے اترا اور اس

پگڈنڈی پر چلنے لگا جو حویلی تک جاتی تھی۔ پگڈنڈی کشادہ تھی اور ہموار بھی تھی۔ علیم اطمینان سے حویلی تک اپنی جیپ لے جا سکتا تھا مگر اس نے پیدل چلنا مناسب سمجھا۔ قریب پہنچا۔ حویلی کی چار دیواری بہت اونچی تھی۔ اور پرانی بھی تھی۔ جگہ، جگہ سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا۔ چار دیواری کا قد آدم پھاٹک بھی بوسیدہ تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس میں تالا بھی پڑا ہوا نہ تھا۔

علیم الدین سبزواری آسانی سے پھاٹک کا ایک پٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطہ میں گھنے درخت تھے۔ خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں، اونچی، اونچی گھاس تھی۔ بارش اب رک گئی تھی۔ احاطہ میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کی آڑ سے سمر لاج کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ برساتی میں سومرو کی لمبی چوڑی سیاہ بیوک کھڑی تھی مگر کار کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔

اس نے سیڑھیاں طے کیں اور اوپر برآمدے میں پہنچ گیا۔ برآمدے کے ستونوں پر گھنی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جو ہوا کے تیز جھونکوں سے جھول رہی تھیں۔ علیم الدین آگے بڑھا۔ صدر دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ اونچا اور چوڑا چکلا تھا۔ اس پر نہایت دیدہ ریزی اور ہنر مندی سے خوب صورت نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ جگہ جگہ پیتل کے باریک تاروں سے پچی کاری کی گئی تھی۔ دروازہ نہایت مضبوط اور عالی شان تھا مگر اس کی چمک دمک اب ماند پڑ چکی تھی۔

علیم دروازے تک تو پہنچ گیا لیکن اب یہ سوال درپیش تھا کہ داد محمد سے کس طرح ملاقات کی سبیل پیدا کی جائے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ سناٹا بھی بہت گہرا تھا اور داد محمد سومرو سے علیم کی زیادہ یاد اللہ بھی نہ تھی، علیم سے اس کی پہلی ملاقات کراچی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ہوئی تھی جس کا بندوبست سومرو کی کوٹھی ہی پر کیا گیا تھا۔ طرح، طرح کے عمدہ اور مرغن کھانوں سے اخبار نویسوں کی تواضع بھی کی گئی تھی۔ جن میں تیتر اور بٹیر کا بھنا ہوا گوشت، خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ تھا۔ نہایت لذیذ تھا اور سب ہی نے رغبت سے کھایا تھا۔ بعد میں بھی سرکاری تقریبات اور غیر ملکی سفارت کاروں کی پارٹیوں میں علیم سے اکثر اس کی ملاقات ہوئی مگر یہ رسم و راہ، صاحب سلامت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ دونوں کے درمیان

اجنبیت اور دوری بدستور حائل رہی۔

داد محمد سومرو کا چہرہ گنبڈے کی طرح چوڑا چکلا، قد ٹھنگنا اور جسم بے ڈول اور بدوضع تھا۔ آنکھیں خوفناک حد تک ابھری ہوئی تھیں۔ آواز حلق سے اس طور نکلتی تھی جیسے ٹین کے خالی پیپے کے اندر سے بول رہا ہو۔ سیاسی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ قومی مسائل کا تجزیہ عام طور پر محکمہ موسمیات کی پیشین گوئیوں کی طرح الل ٹپ کرتا تھا۔ البتہ سرکار دربار میں اس کی رسائی تھی۔ وہ وزیروں اور اعلیٰ حکام سے ہمیشہ خوش گوار تعلقات قائم رکھتا تھا۔ اخبار نویسوں سے مختلف حیلے بہانوں سے ملتا رہتا۔ ان کو متاثر کرنے کی بھی کوشش کرتا۔ وہ ٹھیر ٹھیر کر اور سنبھل سنبھل کر باتیں کرتا تھا۔ بات کہتے کہتے اکثر الجھ جاتا۔ بار بار اپنی سیاہ گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا۔ بولتا کم تھا۔ ہاتھوں اور آنکھوں کی گردش سے زیادہ کام لیتا تھا۔ ہر جملے پر چہرے کے اتار چڑھاؤ میں جاگیردارانہ طنطنہ پیدا کرتا۔ اپنے ہر انداز اور رویہ سے یہ ثابت کرنا چاہتا کہ وہ ارادے کا پختہ تھا۔ قول کا سچا تھا۔ فولاد کی طرح اپنے عزائم میں مضبوط اور مستحکم تھا۔ ایسا مرد آہن تھا جو نہ گر سکتا تھا، نہ پسپا ہو سکتا تھا۔ ریس کھیلنا، یورپ اور امریکہ کے دورے کرنا اور سیاست لڑانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ ان خوش نصیبوں میں سے تھا جو اپنی روزی کے لئے خود محنت نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی محنت پر رانڈ کے سانڈ کی طرح پلتے ہیں اور جن کے پیٹ میں ملک و قوم کا درد اکثر موقع اور بے موقع مروڑ بن کر اٹھتا رہتا ہے۔ داد محمد کے پیٹ میں جب ایسا درد اٹھتا تو وہ فوراً اخبارات کے لیے بیان جاری کرتا اور اسے اپنی تصویر کے ساتھ شائع کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ علیم الدین کا ایسے سیاست دانوں سے آئے دن سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی کمزوریاں معلوم کرنے کی ٹوہ میں رہتا اور اپنے اخبار کے ذریعہ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ یہ اخبار دوپہر کو نکلتا تھا اور ایوننگر کہلاتا تھا۔ مشکل سے ڈھائی تین ہزار چھپتا تھا مگر اس کی لوح کے ساتھ کثیر الاشاعت کا دم چھلا، نمایاں طور پہ درج ہوتا۔ اس میں چٹ پٹی خبروں اور طرح طرح کے سنسنی خیز اسکنڈلوں کے ساتھ ساتھ نجومیوں، پوشیدہ زنانہ اور مردانہ علاج کرنے والے ماہرین اور

فلموں کے ہیجان انگیز اشتہارات شائع ہوتے تھے۔

بارش پھر شروع ہو گئی تھی، ہوا بھی رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

علیم الدین نے صدر دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی مگر وہاں قبرستان کی سی خاموشی چھائی تھی۔ البتہ اوپر کی منزل کی کھڑکیوں کے شیشوں سے روشنی چھن چھن کر اندھیرے میں بکھرتی جا رہی تھی۔ اس نے دروازے کو ہولے سے دھکا دیا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ دروازے پر پیتل کے دو مضبوط کڑے، کنڈوں میں لٹک رہے تھے۔ علیم چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر پیتل کے دونوں کڑوں کو تھاما اور دروازے سے ٹکرا کر آہستہ آہستہ آہٹ پیدا کی مگر نہ دروازہ کھلا نہ حویلی کے اندر کوئی آواز سنائی دی۔

اس نے کسی قدر زور سے کڑوں کو ٹکرایا لیکن اس پرانی حویلی پر بدستور خاموشی چھائی رہی۔ اس نے بار بار کڑوں کو زور، زور سے ٹکرایا۔ کچھ دیر بعد چاپ سنائی دی۔ دروازہ چرچراتا ہوا کھل گیا۔ ایک لحیم شحیم، کالا کلوٹا آدمی جو وضع قطع سے ملازم نظر آتا تھا، دروازے کا ایک پٹ کھول کر سامنے آ گیا۔ اس کا سینہ ڈھول کی طرح ابھرا ہوا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی اس نے علیم سے پوچھا "کون ہو جی تم؟" یہ سوال اس نے اس قدر گرج دار لہجہ میں کیا۔ گویا وہ علیم کو خوفزدہ کر دینا چاہتا تھا۔

علیم نے اس کے گرج دار لہجہ سے مرعوب ہوئے بغیر نہایت اطمینان سے دریافت کیا۔ "سومرو صاحب، جاگ رہے ہیں یا سو گئے؟"

"وہ یہاں نہیں ہیں" اس نے نہایت بے رخی سے اسی گرج دار لہجہ میں جواب دیا۔

علیم پہلے تو ذرا سا جھجکا پھر سنبھل کر بولا "ہیں تو وہ یہیں۔ ان کی کار بھی موجود ہے؟" اس نے برساتی میں کھڑی ہوئی بیوک کی جانب مڑ کر دیکھا "تم اندر جا کر اطلاع کر دو۔"

کالا کلوٹا آدمی نتھنے پھلا کر گرجا "کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"میں کہتا ہوں کہ وہ یہاں ہیں" سبزواری بھی ڈھٹائی پر اتر آیا "اور مجھے ان سے ملنا بھی ہے۔"

وہ شخص بہت سٹ پٹایا۔ لحظہ بھر خاموش رہ کر بولا۔ "اچھا، اگر وہ یہاں ہیں بھی تو مل نہیں سکتے۔"

"کیسے نہیں مل سکتے۔ ضرور ملیں گے۔"

"بس کہہ دیا کہ نہیں ملیں گے۔"

اتنا کہہ کر لحیم شحیم آدمی نے جھٹ دروازہ بند کر دیا۔

سخت کوفت ہوئی۔ علیم الدین بند دروازے کو تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ اتنی رات گئے ایسا خطرناک سفر بھی کیا مگر بات کچھ نہ بنی۔ بارش اب تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا درختوں کی شاخوں سے گزرتے ہوئے سیٹیاں سی بجا رہی تھی۔ اندھیرا اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر کچھ نظر نہ آتا تھا۔ واپس جانے کا بھی سوال پیدا نہ ہوتا تھا اور نہ وہ داد محمد سے ملے بغیر واپس جانے کے ارادے سے آیا تھا۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ چھما چھم مینہ برستا رہا۔ بپھری ہوئی ہوا شور مچاتی رہی۔ علیم نے ہمت نہ ہاری۔ ایک بار پھر ہاتھ بڑھا کر پیتل کے کڑوں کو دروازے سے ٹکرا کر آواز پیدا کی۔ نہ کوئی چاپ سنائی دی، نہ دروازہ کھلا مگر علیم سنر داری باز نہ آیا۔ رک رک کر پیتل کے کڑوں کو دروازے سے ٹکرا کر آہٹ پیدا کرتا۔

کچھ دیر بعد لحیم شحیم آدمی پھر دروازے پر نمودار ہوا اور خونخوار نظروں سے علیم کو گھورنے لگا۔

علیم اس دفعہ بھی اس سے مرعوب نہ ہوا بلکہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے مسکرا کر گویا ہوا۔ "یار، اتنا ناراض کیوں ہوتے ہو!" اس کے لہجہ میں بے تکلفی تھی۔ "یہ تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام عبدالرحمان مگسی ہے۔" اس کے چہرے پر بدستور جھنجھلاہٹ چھائی رہی۔ "پر، تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے قدرے توقف کیا۔ "اور تم ابھی تک یہاں سے گئے بھی نہیں۔"

اس کے لہجہ میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ نیند کی غنودگی کا اثر معلوم ہوتا تھا۔ علیم فوراً تاڑ گیا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ "تم سمجھتے ہو میں آسانی سے چلا جاؤں گا۔"

مگسی بھنا گیا۔ "اچھا تو جی بھر کھڑے رہو۔"

مگسی نے ایک بار پھر دروازہ بند کر دیا لیکن وہ چند ہی قدم گیا ہو گا کہ علیم نے پیتل کے کڑوں کو دروازے سے ٹکرا کر کھنکھٹایا۔ مگسی جھنجھلایا ہوا واپس آیا بگڑ کر بولا۔ "تم سے کہہ دیا کہ وہ نہیں مل سکتے۔"

وہ کھا جانے والی نظروں سے علیم کو گھورنے لگا۔

"میں کہتا ہوں وہ ملینگے اور ضرور ملیں گے۔"

"اچھا تو پھر مل لو۔"

دروازہ چرچراتا ہوا بھڑ سے بند ہوگیا۔ علیم نے فوراً ہی اسے کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا۔ مگسی آنکھیں نکال کر غرّایا۔ جھنجلاہٹ اور خفگی کا مظاہرہ کیا۔ علیم ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

کئی بار دروازہ بند ہوا کئی بار کھلا۔

اب علیم کو اس سے چھیڑ خانی کرنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ آخر کالا کلوٹا عبدالرحمان مگسی زِچ ہو کر خوشامد پر اتر آیا۔ کہنے لگا "سائیں تم نے ہماری نیند خراب کردی۔ ہم کو سویرے بہت تڑکے اٹھنا پڑتا ہے۔ تم ہم کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟"

"اور میں یہاں آرام سے کھڑا عیش کر رہا ہوں۔"

"تو پھر اپنے گھر جاؤ، آرام کرو۔ بعد میں مل لینا۔"

"لیکن مجھے تو اسی وقت ملنا ہے۔" علیم نے نرم لہجہ میں اپنی مجبوری جتانے کی کوشش کی۔ "ملنا بہت ضروری ہے، ورنہ میں اتنی رات کو یہاں کیوں آتا۔ سومرو صاحب ہی نے مجھے یہاں ملنے کے لئے بلایا تھا۔"

"پر انھوں نے حکم دیا ہے کہ رات کو وہ کسی سے نہیں ملیں گے۔"

"ان کو یاد نہ رہا ہوگا" علیم نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکالا مگسی کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لو، یہ کارڈ ان کو پہنچا دو۔ وہ فوراً مجھے بلا لیں گے۔"

مگسی نے کارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ "نا سائیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ میں ان کے پاس نہیں جاسکتا۔ ایسا تو میں ہرگز نہیں کرسکتا۔" اس کے روّیہ سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ علیم کو کسی طور اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔

علیم نے فوراً پینترا بدلا۔ دس روپے کا ایک کرارا نوٹ نکالا۔ مگسی کی جانب بڑھایا "لو، اسے رکھ لو"۔ مگسی نے جھجکتے ہوئے نوٹ لے لیا لیکن اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا رہا۔ رشوت لے کر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ علیم نے بے چین ہو کر کہا "یار اب تو اندر آنے دو"۔ وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا "یوں کب تک کباب میں ہڈی بنے کھڑے رہو گے؟"

مگسی نظریں جھکائے چند لمحے سوچتا رہا، پھر اس نے علیم کو نظر بھر کر دیکھا۔ بولا "سائیں معاف کرنا اس دروازے سے تو تم ہرگز اندر نہیں آ سکتے۔ ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ رات کو اس دروازے سے کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے۔ ہم مالک سے نمک حرامی نہیں کر سکتے"۔ اس نے گردن موڑ کر اس کھڑکی کو دیکھا جو دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی "تم چاہو تو اس کھڑکی سے اندر آ سکتے ہو۔"

ظاہر ہے علیم کو اس تجویز پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ فوراً رضامند ہو گیا "تم کہتے ہو تو دروازے کے بجائے کھڑکی سے اندر آ جاؤں گا۔ تم ہرگز نمک حرامی نہ کرو۔"

مگسی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔ علیم مڑا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا اور بارش کے چھینٹوں سے بچتا بچاتا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ زیادہ اونچی بھی نہ تھی۔ علیم ہمت کر کے اوپر چڑھ گیا۔ مگسی وہاں موجود تھا۔ اس نے علیم کا بازو پکڑ کر سہارا دیا۔ علیم نیچے اترا۔ اب وہ حویلی کے اندر پہنچ چکا تھا۔

دونوں دھندلی دھندلی روشنی میں خاموش کھڑے تھے۔ باہر رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی شور مچا رہی تھی۔ علیم نے خاموشی کو توڑا۔ سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

"سومرو صاحب کہاں ہیں۔ جاگ رہے ہیں نا؟"

"سائیں اوپر کے کمرے میں ہیں۔" مگسی نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا "ابھی جاگ رہے ہیں۔ جاؤ جا کر مل لو۔"

"اوپر جانے کا راستہ تو بتا دو"، علیم نے بے چین ہو کر کہا، "مجھے تو یہاں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

مگسی مڑا۔ علیم کی جانب دیکھے بغیر بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" وہ آگے بڑھا۔ علیم اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ دونوں ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ غلام گردش سے گزر کر ایک وسیع ہال میں پہنچے۔ ہال بہت شاندار تھا۔ فرنیچر پرانا تھا مگر قیمتی تھا۔ دیواروں پر تصاویر کے ساتھ ساتھ عہد رفتہ کی یادگار پرانی بندوقیں، ڈھالیں اور تلواریں سلیقے سے آراستہ تھیں۔ عمدہ اور دبیز قالین کا فرش تھا۔ وکٹورین طرز کے ہال کو دیکھ کر علیم بہت مرعوب ہوا مگر خاموش رہا۔

ہال کے ایک گوشہ میں زینہ تھا۔ جس کی سیڑھیاں ہلکا سا نیم دائرہ بناتی ہوئی اوپر جاتی تھیں۔ دونوں زینے کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچ کر مگسی نے سرگوشی میں کہا: "اب تم اوپر جاؤ۔" اس نے قدرے توقف کیا: "سائیں نے تم کو ملنے کے لیے بلایا ہے نا؟" مگسی نے مڑ کر علیم کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"بالکل بلایا ہے۔" علیم نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔" مگسی نے علیم کو خبردار کیا: "سائیں تم کو پتہ نہیں۔ خان صاحب کا غصہ بہت خراب ہے۔ اگر وہ ناراض ہوا یا کوئی گڑبڑ ہوئی تو تم ہی آگے نمٹنا۔ ہمارا نام نہ لینا۔ بالکل یہ نہ بتانا کہ ہم نے تم کو اندر آنے کا راستہ بتایا۔" اس نے قہر آلود نظروں سے دیکھا: "یہ سمجھ لو وہ الٹا لٹکا کر ہماری چمڑی ادھیڑ ڈالے گا اور نوکری سے نکال دے گا۔ پر ہم تمہارا سر توڑ ڈالیں گے۔"

"نہیں، نہیں ایسا نہیں ہوگا۔" علیم نے خائف ہو کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی: "تم بالکل اطمینان رکھو۔"

مگسی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ علیم الدین زینے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ اس نے مڑ کر نیچے دیکھا۔ مگسی وہاں موجود نہ تھا۔ علیم آگے بڑھا۔ اس کمرے کے قریب پہنچا جس سے روشنی نکل کر باہر پھیلی ہوئی تھی۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ علیم نے جھجکتے ہوئے پردہ آہستہ سے کھسکایا۔ اندر نظر ڈالی تو ٹھٹک کر جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔

کمرہ خوب کشادہ تھا۔ دروازے کے عین مقابل داد محمد سومرو ایک چوڑے چکلے صوفے پر

بہ نہایت اطمینان سے بیٹھا تھا صوفے کے قریب جھلکتی ہوئی میز رکھی تھی میز پر وہسکی کی کھلی ہوئی بوتل تھی۔ پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ تھا گلاس تھا جس میں وہسکی تھی۔ اس وقت سومرد کا چہرہ اور بھی بھدّا نظر آرہا تھا۔ سر کے بال جنگلی گھاس کی طرح کھڑے تھے۔ وہ لمبا ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر سیاہ رنگ کی چھوٹی سی دوربین لگائے ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ علیم نے مڑکر اس سمت نگاہ دوڑائی۔

سامنے دیوار سے پیٹھ لگائے ایک دلکش اور طرح دار لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر نام کو لباس نہ تھا۔ آنکھوں میں پچھلی رات کے ستارے جھلملاتے تھے۔ رخساروں پر تازہ گلاب کھلتے تھے۔ سرخ سرخ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ مگر اس کے چہرے سے بے چینی صاف جھلکتی تھی۔ ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کا برہنہ جسم بلور کی طرح ترشا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک ایک عضو مچھلی کی مانند پھڑکتا تھا۔ داد محمد سومرو ہاتھ ہلا کر اشارہ کرتا۔ وہ کبھی جھک جاتی کبھی جسم کو موڑ لیتی کبھی تن کر کھڑی ہو جاتی۔

داد محمد سومرد کے ایک ہاتھ میں دوربین دبی تھی۔ دوسرے کو ادھر ادھر ہلا کر ہدایات دیتا۔ اسی ہاتھ سے رک رک کر گلاس اٹھاتا۔ وہسکی کی چسکی لگاتا۔ کبھی مسکراتا، کبھی منہ بگاڑ کر ناگواری کا اظہار کرتا۔ کبھی آڑا ہو جاتا، کبھی ترچھا۔ وہ دیوار کے قریب کھڑی ہوئی لڑکی کے سڈول جسم کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا اور اپنی دھن میں ایسا مگن تھا کہ اسے علیم الدین کی موجودگی کا مطلق پتہ نہ چلا۔

علیم الدین سبزداری نے دروازے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے سوچا کہ لڑکی واقعی غضب کی دل کش اور دل آرا ہے۔ ہلکی ہلکی نیلی روشنی نے اس کے حسن و شباب کو اور نکھار دیا ہے۔ کسی عشوہ طراز اور کافر ادا حسینہ کو دیکھنا ہو تو ایسی ہی ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی میں دیکھا جائے اور دوربین آنکھوں پر لگا کر دیکھا جائے تو اس کے سڈول جسم کے زاویے اور خطوط کچھ اور ہی تاثر پیدا کرتے ہوں گے۔ علیم اس نقشہ سامان کی رعنائی سے ابھی لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ اچانک وہ مڑی۔ اس کی نگاہیں دروازے کی سمت پہنچیں۔ اس نے پریشان ہو کر علیم الدین سبزداری کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور دہشت طاری ہو گئی۔ حلق سے چیل کی سی تیز آواز نکلی۔ بدحواس ہو کر آگے بڑھی اور بھاگ کر داد محمد سومرد کے صوفے کی اوٹ میں دبک گئی۔

سومرد نے آنکھوں سے لگی ہوئی دوربین ہٹائی۔ حیرت زدہ ہو کر سامنے کھڑے ہوئے علیم الدین کو دیکھا۔ پریشان ہو کر آنکھیں پٹ پٹائیں۔ نشے میں ڈوبی ہوئی بوجھل آواز میں بولا۔" یہ تو کوئی مانسٹر معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کوئی مانسٹر ہی ہے کسی تو نہیں لگتا۔ یہ تو کوئی اور ہے "۔ وہ آنکھیں پھاڑے حیران و پریشان نظروں سے علیم کی جانب گھورتا رہا۔ "کون ہو جی تم ؟" اتنا کہہ کر وہ نشے سے جھوم کر ذرا سا آگے کو جھک گیا۔

علیم نے اسے اس سرخوشی کے عالم میں دیکھا تو ساری گھبراہٹ اور پریشانی جاتی رہی۔ نڈر ہو کر بولا۔" میں وہ ہوں جسے آپ پہچان کر بھی پہچان نہیں رہے ہیں "۔ وہ بڑھ کر سامنے آگیا۔

داد محمد سومرد ایک بارگی جیسے ٹین کے خالی پیپے کے اندر اتر گیا۔ بطخ کی طرح قیں قیں کر کے ہنسنے لگا۔ پھر اکر گویا ہوا "او ہو، ہو، ہو، تم وہ ہو جسے پہچان کر بھی پہچان نہیں رہا ہوں۔ بات تو کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔ لگتا ہے تم کو پہلے بھی دیکھا ہے "۔ پھر اچانک چونک کر اس نے پوچھا۔

"مگر تم یہاں آئے کیسے ؟"

" اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو میں اس دروازے سے آجاؤں۔ جس سے کمرے کے اندر آنا چاہیئے "۔ علیم بدستور غیر سنجیدہ بنا رہا۔ " کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ چور دروازہ کون سا ہے اور کس طرف ہے ؟"

" میں پوچھتا ہوں، تم کو کس نے یہاں آنے کی اجازت دی "۔ اس دفعہ داد محمد نے گرج دار آواز میں کہا۔" تم کو میرے ملازم نے روکا کیوں نہیں۔ میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دیا جائے۔"

علیم ذرا مرعوب نہ ہوا۔ ڈھٹائی سے بولا۔" آپ کا ملازم بڑا نمک حلال ہے۔ اس نے مجھے بڑے دروازے میں داخل ہونے کی کسی طرح اجازت نہیں دی۔ البتہ وہ کھڑکی بتا دی جس کو پھاند کر میں یہاں تک پہنچ گیا۔"

داد محمد نے گھور کر اسے دیکھا۔ گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ علیم نے موقع غنیمت جانا۔ آگے بڑھا اور اطمینان سے ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اب دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ داد محمد نے گلاس

میز پر رکھ کر علیم کو تیکھی نظروں سے دیکھا لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہے۔ علیم نے صوفے کی آڑ سے نظر آنے والی لڑکی کی ایک برہنہ ٹانگ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ان محترمہ سے کہیے کہ اپنے جسم کو اچھی طرح چھپالیں۔ ان کی یہ باہر نکلی ہوئی ٹانگ اچھی نہیں لگتی یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سامنے آکر اطمینان سے بیٹھ جائیں"۔ لڑکی نے فوراً اپنی ٹانگ سمیٹ کر کے صوفے کی آڑ میں کرلی۔

داد محمد سومرو تیوری پر بل ڈال کر غصے سے بولا: "تم اس کے بارے میں اس طرح بات نہیں کر سکتے۔ وہ تمہارے سامنے کیسے آسکتی ہے؟ اس کے بدن پر کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے ایک ایک کپڑا اتروالیا تھا۔ وہ اس حالت میں تمہارے سامنے کس طرح آسکتی ہے؟"

علیم نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا: "بالکل اسی طرح جیسے وہ آپ کے سامنے آسکتی ہے"۔

"میرے سامنے؟" سومرو بھنّا کر بولا: "یعنی تم میرے بارے میں کہہ رہے ہو۔ جانتے ہو میں اس کو کراچی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ صرف آج رات کے لیے پانچ سو روپے دیئے ہیں۔ پورے پانچ سو"۔

"کوئی بات نہیں پانچ سو روپے اور دے دیجئے۔"

"کیوں دے دوں۔ کس لیے دے دوں؟" اس دفعہ وہ زور سے دھاڑا۔

"دیکھئے اس قدر خفا ہونے کی ضرورت نہیں"۔ علیم نے نرم لہجہ میں کہا: "میں آپ کا مہمان ہوں۔ اور آپ تو بہت مہمان نواز واقع ہوئے ہیں"۔ وہ زیرلب مسکرایا: "ایک شو تو ہوچکا۔ سیکنڈ شو کے لیے میرا ٹکٹ بھی لے لیجئے۔ صرف پانچ سو روپے کی تو بات ہے۔ آپ کے ایسے خاندانی رئیس کے لئے تو یہ بہت معمولی رقم ہے۔"

داد محمد سومرو کچھ نہ بولا۔ اس نے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ جگ اٹھا کر پانی ڈالا۔ پیگ بنایا۔ اور گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ وہسکی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ نظریں اٹھا کر علیم کو دیکھا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا: "تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ فوراً باہر نکل جاؤ"۔ اس کی ابھری ہوئی بڑی بڑی آنکھیں غصے سے اور خوفناک ہوگئیں۔

"مجھ کو معلوم تھا۔ آپ یہی بات کہیں گے لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ جو شخص اتنی رات گئے

کھڑکی پھاند کر یہاں آسکتا ہے۔ اس آسانی سے کیسے نکل سکتا ہے"۔

"پھر تم کس طرح یہاں سے جاؤ گے ؟"

"جس طرح میرا دل چاہے گا،" علیم نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا۔

داد محمد سومرو غصے اور نفرت سے سرخ پڑ گیا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں زور، زور سے سانس بھرنے لگا۔ علیم بغور اس کے ہاتھ کی جانب دیکھتا رہا کہ اگر وہ گلاس اٹھا کر مارے تو اپنا سر صاف بچالے۔

باہر چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ ہوائیں شوریدہ سری تھی۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ اچانک کوئی زور سے چیخا۔ "باپ رے باپ، مار ڈالا سالے نے"۔

دونوں نے سراسیمہ ہو کر اس طرف دیکھا۔ پردے کے پیچھے سے ایک شخص اپنا بازو سہلاتا ہوا نکلا اور سامنے آگیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ صرف ایک میلا چیکٹ جانگیا پہنے ہوئے تھا۔ ننگے بدن پر خوب تیل چپڑا ہوا تھا۔ وہ بار بار دونوں کو دیکھ رہا تھا اور اپنا بازو سہلا رہا تھا۔ نہ وہ حیران تھا نہ پریشان۔ نہایت اطمینان سے کھڑا تھا۔ اس کا تیل سے چپڑا ہوا بدن روشنی میں چمک رہا تھا۔

داد محمد سومرو چند لمحہ تو سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو جی ؟"

وہ بولا۔ "میرا نام بھورے خاں ہے۔"

"بھورے خان کے بچے۔ میں پوچھتا ہوں تم یہاں کیسے آئے کس لیے آئے ؟" داد محمد نے ڈپٹ کر کہا۔

"صاف بات یہ ہے کہ آیا تو میں چوری کی نیت سے تھا۔" بھورے خان نے صاف گوئی سے بتایا۔ "میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"اچھا تو چوری کے لئے یہاں آیا تھا۔"

"میں نے آپ کی تجوری بھی کھول لی تھی۔" بھورے خان نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "یہ ہاتھ دیکھ رہے ہیں آپ۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے۔ "کیسا بھی تالا ہو چٹکی بجاتے ان ہاتھوں سے کھول لیتا ہوں۔ ایسے مانے ہوئے استاد سے یہ ہنر سیکھا کہ بڑے بڑے کاریگر ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ ایسی دھاک بیٹھی تھی کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ ان کے پیشاب سے چراغ جلتا تھا۔"

"بند کر اپنی بکواس۔" داد محمد سومرو تلملا کر زور سے گرجا۔ "میں تجھے جیل میں بند کرا دوں گا۔"

"ارے، ارے، آپ اس قدر خفا کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے تجوری میں سے کچھ اٹھایا ہو تو قسم لے لیجئے۔" بھورے خان نے مسکین سی صورت بنا کر سادگی سے کہا۔ "اس میں دھرا ہی کیا تھا۔ جنے کیا الّم غلّم بھرا تھا۔ عورتوں کی تصویریں تھیں۔ ایک دم ننگی ننگی۔ دوائیوں کی چھوٹی بڑی شیشیاں تھیں، انجکشن لگانے کی سرنج تھی۔ یہ بڑی سی۔"

اس کی باتیں سن کر علیم الدین سبز داری کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

داد محمد نے علیم کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ قہر آلود نظروں سے بھورے خاں کو دیکھا۔ "نکل جا یہاں سے بدمعاش۔" وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔" بھورے خاں نے اطمینان سے کہا۔ "میں تو یہاں سے بہت پہلے ہی چلا جاتا۔ وہ تو عین موقع پر آپ کمرے کے اندر آ گئے۔ میں گھبرا کر پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ پھر جو آپ نے آنکھوں پر دوربین لگا کر تماشا شروع کیا۔ قسم اللہ کی، جوانی کا مزہ آ گیا۔ مگر کسی کیڑے نے ایسا کاٹا کہ اب تک کھجلی ہو رہی ہے۔" اس نے اپنا بازو سامنے کر دیا جس پر سرخ سرخ دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ "یہ دیکھیے۔ سالے نے کیسا کاٹا ہے۔"

"فضول کی بکواس نہ کرو اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔" داد محمد نے ایک بار پھر اس کو ڈانٹا۔

مگر بھورے خاں چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور برابر بازو کو سہلاتا رہا، کھجاتا رہا۔ داد محمد سومرو غصے سے دوبارہ برسنے ہی والا تھا کہ بھورے خاں بول پڑا۔ "خفا نہ ہوں۔ میں ابھی چلا جاؤں گا ذرا سی پینے کو مل جائے۔ کئی دن سے ایک گھونٹ نہیں ملی۔" اس نے للچائی ہوئی نظروں سے میز پر رکھی ہوئی

وہسکی کی بوتل کو دیکھا: "اصلی ولایتی معلوم ہوتی ہے۔ صاحب، آپ کی بھی کیا بات ہے۔ گلاس پر گلاس چڑھا گئے اور ویسے کے ویسے ہی بیٹھے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا: "اجازت ہو تو لگا لوں دو گھونٹ؟ قسم خدا کی دل بُری طرح مچل رہا ہے۔"

علیم الدین اب خاموش نہ رہ سکا۔ کہنے لگا: "اب تم خواہ مخواہ انتظار کر رہے ہو۔ اٹھاؤ بوتل اور شروع ہو جاؤ۔"

بھورے خاں کچھ نہ بولا۔ آگے بڑھا اور بوتل اور گلاس اٹھا لیا۔ مڑ کر علیم کی جانب دیکھا۔ علیم نے اشارے سے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا قریب پہنچا اور برابر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ اسے اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"تم دونوں فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔" سومرو غصے سے چیخا۔

"دیکھئے مسٹر سومرو! زیادہ جوش نہ دکھائیے۔" علیم نے سنجیدگی سے کہا: "یہ شخص جو میرے نزدیک بیٹھا مزے سے وہسکی پی رہا ہے۔ اس کی انگلیاں لوہے کی تجوری توڑ ڈالتی ہیں۔ آدمی کا سر تو یہ اس قدر آسانی سے توڑ سکتا ہے۔ جیسے اخروٹ کے اندر سے گری نکالی جاتی ہے۔"

وہ جھنجھلا کر بولا: "معلوم ہوتا ہے، تم اس کے ساتھی ہو۔"

"جی نہیں! میں اخبار 'ندائے وطن' کا ایڈیٹر ہوں۔" علیم نے اپنا تعارف کرایا۔

داد محمد سومرو نے چونک کر علیم کو دیکھا۔ یقین نہ آنے کے انداز میں بولا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ایسے ہی ہو سکتا ہے، جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔"

اُسی وقت لڑکی نے صوفے کی آڑ سے ہلکی سی آہ بھری۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اینٹھنے لگا تھا اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ اس کی پیٹھ کا بالائی حصہ روشنی میں آ گیا تھا۔ ہلکی نیلی روشنی میں اس کی اجلی اجلی جلد پھولوں کی مانند نرم اور گداز معلوم ہو رہی تھی۔

علیم الدین سبزواری نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ داد محمد سومرو کو مخاطب کیا: "مسٹر سومرو، ہم لوگ باتوں میں ایسے الجھے کہ بالکل بھول گئے۔ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔"

"یہاں اور کون موجود ہے ؟" اس نے حیرت سے منہ پھاڑ کر پوچھا۔

"ذرا اپنے صوفے کے پیچھے مڑ کر دیکھئے۔"

"اچھا، اچھا! تم شیریں کی بات کر رہے ہو۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ مگر فوراً منہ بگاڑ کر بولا۔ "تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔" علیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کا پردہ جھٹکا مار کر علیحدہ کیا۔ مڑا اور داد محمد کے قریب پہنچ کر پردہ صوفے کے پیچھے پھینکا۔ شیریں سے کہا "لو، اسے بدن پر لپیٹ لو۔" اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی "غسل خانہ ہی زیادہ نزدیک ہے۔ اس میں چلی جاؤ۔"

صوفے کی پشت پر ہلکی ہلکی سرسراہٹ ہوئی۔ علیم الدین سبزواری پھر اپنے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ شیریں جسم کو پردے سے چھپاتے ہوئے جھجکی جھجکی اٹھی اور غسل خانے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے پلٹ کر سبزواری کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں سرِ شام نکلنے والے ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ اسے خود فراموشی کے عالم میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ شیریں نے دروازہ کھولا اور غسل خانے کے اندر داخل ہو گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔

داد محمد خاموش بیٹھا تھا۔ بھورے خاں سب سے بے نیاز وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

"آپ نے آج صبح ایک بیان جاری کیا تھا۔" سبزواری نے داد محمد سومرو کو مخاطب کیا "میں اس کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بھی کوئی سیاست پر بات کرنے کا وکھت ہے۔"

"میرا خیال ہے یہی سب سے زیادہ موزوں وقت ہو سکتا ہے۔" علیم نے مسکرا کر کہا۔

"جی نہیں، میں اس وکھت کوئی ایسی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

علیم کچھ نہ بولا۔ نظر بھر کر داد محمد کو دیکھا۔ اس کا چہرہ جھنجلاہٹ سے سرخ ہو رہا تھا۔ علیم الدین نے اس کی خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "کہیئے، آپ کا یورپ کا دورہ کیسا رہا؟"

"آپ 'ندائے وطن' ہی کے تو ایڈیٹر ہیں نا؟" داد محمد نے دریافت کیا "کیا نام ہے آپ کا؟"

"علیم الدین سبزواری ۔"

"مسٹر سبزواری، مجھے آپ سے سخت شکایت ہے ۔" داد محمد کے چہرے سے جھنجھلاہٹ مٹ جاتی رہی "آپ کے اخبار نے تو میرے خلاف خواہ مخواہ ایک اسکینڈل کھڑا کر دیا تھا ۔"

علیم الدین سبزواری، اسے مرعوب کرنے کے لئے یہی بات یاد دلانا چاہتا تھا۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ داد محمد سومرو جس زمانے میں فرانس میں تھا۔ انہی دنوں "ندائے وطن" میں ایک سنسنی خیز خبر شائع ہوئی تھی۔ خبر پیرس کے ایک مشہور نائٹ کلب کی ایک اطالوی نژاد کیبرے ڈانسر کے بارے میں تھی۔ جسے پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ پیرس کی پولیس بھاگ دوڑ اور تمام کوششوں کے باوجود نہ تو قتل کے اسباب کا سراغ لگا سکتی تھی اور نہ کسی مشتبہ شخص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ مقامی اخبارات میں اس پراسرار قتل کا بہت چرچا ہوا۔ مقتولہ کے بارے میں پولس نے معلومات حاصل کیں تو بہت سے راز ہائے سربستہ افشا ہوئے۔ اس کے جن افراد سے مراسم تھے۔ ان میں داد محمد سومرو کا نام بھی شامل تھا۔ یہ خبر لندن کے ایک انگریزی اخبار میں بھی نہایت تفصیل سے شائع ہوئی۔ یہ اخبار کسی طور علیم الدین سبزواری کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے "مکتوب پیرس" بنا کر "ندائے وطن" میں نہ صرف نمایاں طور پہ شائع کیا بلکہ اداریہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ پاکستان کے بعض سرکردہ اور معزز افراد یہ حیلہ تراش کر بیرونی ممالک کے دورے کرتے ہیں کہ وہاں زراعت کے جدید اور ترقی یافتہ طریقوں کا مشاہدہ کریں گے ۔ نئی صنعتوں کی نشوونما کے متعلق ضروری معلومات حاصل کریں گے مگر اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ ان کی راتیں، نائٹ کلبوں، شراب خانوں، قمار خانوں اور عیاشی کے اڈوں میں گزرتی ہیں اور اس طرح عوام کے گاڑھے پسینے سے کمایا ہوا قیمتی زرمبادلہ بے دردی سے برباد کیا جاتا ہے اور ملک کی عزت اور قومی وقار کو رسوا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں داد محمد سومرو کو خصوصیت کے ساتھ ہدف ملامت بنایا گیا تھا ۔

علیم الدین جو "ندائے وطن" کا ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ مالک بھی تھا۔ اس قسم کے اسکینڈل شائع کرنے کے معاملہ میں خاصا مشہور تھا۔ ایسے ہی اسکینڈلوں اور سنسنی خیز خبروں کے ذریعہ وہ "ندائے وطن" کو چلا رہا تھا۔ اس نے خبر کی اشاعت کے بعد اخبار کی ایک کاپی نہ صرف داد محمد کے مینجر کے پاس

پہنچائی۔ بلکہ اس کے بارے میں گمنام ٹیلی فون کے ذریعہ مطلع بھی کیا اور اطمینان سے نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔ نتیجہ حسب توقع خاطر خواہ نکلا۔ مینجر نے خبر پڑھتے ہی فوری طور پر "ندائے وطن" کے تراشے کے ساتھ داد محمد سومرو کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ داد محمد سخت برہم ہوا۔ اپنے غم و غصہ کا اظہار اس طرح کیا کہ وکیل کے ذریعہ علیم الدین کو نوٹس بھیجا کہ آٹھ روز کے اندر، اندر خبر کی تردید شائع کی جائے، ورنہ ہتک عزت کے الزام میں "ندائے وطن" کے خلاف دو لاکھ روپے ہرجانے کا مقدمہ دائر کیا جائے گا۔

نوٹس ملنے کے بعد علیم سبزواری ذرا مرعوب نہ ہوا۔ وہ تو چاہتا بھی یہی تھا۔ چنانچہ وکیل کو جواب بھیجنے کے بجائے اس نے نوٹس کی نقل اپنے اخبار میں شائع کردی۔ ساتھ ہی سومرو کو چیلنج کیا کہ "ندائے وطن" کے خلاف بلا تاخیر عدالتی کارروائی کی جائے۔ خبر کے صحیح اور مصدقہ ہونے کے سلسلہ میں ضروری دستاویزی ثبوت عدالت میں پیش کردیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ جلد ہی "ندائے وطن" میں مزید سنسنی خیز انکشافات کئے جائیں گے اور ان کی تائید میں دلچسپ اور اہم تصاویر کے ساتھ ان رقومات کے بل اور رسیدوں کا عکس بھی شائع کیا جائے گا جو سومرو نے اپنی عیاشی پر خرچ کی تھیں حالانکہ علیم کے پاس نہ ایسی کوئی تصویر تھی نہ رسید تھی، نہ بل تھا مگر وہ سومرو کی کمزوری سے بخوبی آگاہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس دھمکی کے ساتھ ہی سومرو ہتھیار ڈال دے گا۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ کچھ ہی روز بعد سومرو کا مینجر گھبرایا ہوا علیم کے پاس آیا۔ عاجزی کا اظہار کیا۔ تین ہزار روپے دیئے اور داد محمد سومرو کی جانب سے معذرت بھی کی۔ علیم نے تردید شائع کردی۔

یہ واقعہ اب پرانا ہوچکا تھا مگر علیم الدین کو اب تک اس کی ایک ایک تفصیل یاد تھی۔ اس نے مسکرا کر داد محمد کو مخاطب کیا "مسٹر سومرو، اس قضیہ کو تو آپ نے وکیل کے ذریعہ نوٹس دے کر خواہ مخواہ بڑھایا تھا۔"

"اس اسکینڈل سے میری بہت بدنامی ہوئی تھی۔" داد محمد نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"لیکن، میں نے اس کی تردید بھی شائع کردی تھی۔"

سومرو نے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ "آپ میرے پاس اب کس لئے آئے ہیں؟" اس کے لہجہ سے

بے زاری عیاں تھی۔

"دراصل میں آپ کا انٹرویو لینا چاہتا تھا تاکہ اس کی روشنی میں اس بیان پر مناسب اظہار خیال کیا جائے، جو آپ نے کل جاری کیا تھا،" علیم نے وضاحت کی"۔ وہ بیان شائع کر دیا گیا ہے۔ آپ نے 'ندائے وطن' میں دیکھا بھی ہوگا۔"

داد محمد سومرو نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھا۔ لڑکھڑاتا ہوا الماری تک گیا۔ اسے کھولا۔ وہسکی کی نئی بوتل نکالی۔ واپس آیا اور اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے بوتل کھولی۔ وہسکی گلاس میں ڈالی۔ پانی ملایا گلاس اٹھایا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

علیم خاموش بیٹھا رہا۔ چند لمحے بعد سومرو نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"ہاں مسٹر۔" وہ لمحہ بھر کے لئے اٹکا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

"علیم الدین سبزواری،" علیم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں تو مسٹر علیم، اب میں آپ سے بات کر سکتا ہوں۔" اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ "پوچھیے کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟"

اب وہ نہایت خوش گوار موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر چھائی ہوئی کھشونت زائل ہو چکی تھی۔ خمار آلود آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ اس وقت وہ ایسا چھوٹا موٹا گینڈا نظر آ رہا تھا۔ جس کے سر پر کوئی سینگ نہ تھا۔

علیم الدین سبزواری نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ سلگا کر چند کش لگائے۔ نوٹ بک سنبھالی اور قلم انگلیوں میں دبا کر سوال کیا۔ "پچھلی ربیع کی فصل پر آپ نے کتنے ہزار ٹن گندم سرحد پار بھجوائی؟"

"کیا مطلب؟" داد محمد سومرو کا موڈ فوراً خراب ہو گیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا: "آپ اخبار کے ایڈیٹر ہیں یا خفیہ پولس کے اہل کار؟"

"دیکھیے خفیہ پولس تو ساری کی ساری کمیونسٹوں اور ایسے ہی دوسرے ملک دشمن عناصر کے

پیچھے لگا دی گئی ہے۔" علیم نے اس کی خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو تو خفیہ پولس سے ذرا بھی خطرہ نہ ہونا چاہیئے۔ ویسے بھی وہ آپ کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ آپ تو محب وطن سیاست دان ہیں، نہایت معزز شہری ہیں۔"

"کیا آپ کے خیال میں۔ میں محب وطن اور معزز شہری نہیں ہوں۔" اس نے گھور کر علیم کو دیکھا۔ "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اسمگلر ہوں؟"

"یہ میری کہاں مجال کہ آپ کے متعلق ایسا خیال دل میں لاؤں۔ آپ تو ہر طرف سے محب وطن اور معزز شہری نظر آتے ہیں۔" علیم نے نرم لہجہ میں کہا۔ "برسات کی اس بھیگی بھیگی رم جھم کرتی رات میں سمر لاج کے اس عشرت کدہ میں بیٹھ کر وہسکی سے شغل فرماتے ہیں اور پورے کپڑے پہن کر دوربین سے برہنہ جوانی کا نظارہ کرتے ہیں۔"

داد محمد سومرو اپنی گول، گول آنکھوں سے علیم کو ہونق کی طرح دیکھ رہا تھا۔ بھورے خاں کو دونوں کی گفتگو سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے خود میں مگن تھا۔ وہسکی سے بھرا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ کبھی اسے ہونٹوں سے چومتا۔ کبھی گالوں سے لگاتا۔ کبھی روشنی کے سامنے کر کے اس کا رنگ دیکھتا اور آہستہ آہستہ وہسکی کی چسکی لگاتا۔ وہ نہایت بے نیازی کے عالم میں اپنی علیحدہ دنیا بسائے ہوئے تھا۔

بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشے پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ رات بھیگ کر سرد ہو گئی تھی۔ سمر لاج کے باہر ہر سو اندھیرا تھا۔ ویرانی تھی۔ سناٹا تھا۔

"معاف کیجیے گا مسٹر سومرو۔" علیم نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ گندم اور دوسرا غلہ سرحد پار بھیجنے کے بعد آپ کو کس قدر رقم مل جائے گی؟"

"کیا آپ تھانے میں میرے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہتے ہیں؟" سومرو نے جل کر کہا۔

"آپ کو مغالطہ ہوا۔" علیم نے سنجیدگی کا دامن ہنوز ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ "میں تو یہ بات اس لئے جاننا چاہتا ہوں تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ آئندہ الکشن پر آپ کتنی رقم صرف کر سکیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ

آپ نے نہ صرف ربیع کی فصل کا غلہ بلکہ خریف کی فصل کی تمام کپاس صرف اسی مقصد کے لئے وقف کر دی ہے۔ کیا یہ اطلاع درست ہے؟"

"یہ بات میں آپ کو ہر گز نہیں بتاؤں گا۔" داد محمد سومرو نے بگڑ کر کہا۔ "آپ بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے اخبار میں کوئی نیا اسکنڈل بنا کر چھاپ دیں گے۔"

علیم کھکھلا کر ہنسا۔ "آپ اس قدر برا مان رہے ہیں تو میں ہرگز ایسی بات نہیں پوچھوں گا۔" اس نے نظر بھر کر سومرو کی جانب دیکھا۔ "آپ سندھ کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ یہ تو آپ کو علم ہو گا کہ آپ کی زمینداری کتنے ہزار ایکڑ پر مشتمل ہے۔"

داد محمد سومرو کچھ دیر خاموش بیٹھا غور کرتا رہا، پھر بے زاری سے بولا۔ "سائیں صاف بات یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ یہ بات تو میرے والد کیا، دادا کو بھی معلوم نہ تھی۔ ایسی باتیں ہمارے مینجروں اور منشیوں کے جاننے کی ہوتی ہیں۔ آخر ان کو تنخواہ کس بات کی دی جاتی ہے۔"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" علیم نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "میں پوچھ سکتا ہوں کہ فصلوں کی بٹائی اور طرح طرح کے ٹیکسوں کی صورت میں ہر سال ہاریوں سے آپ کتنی رقم وصول کر لیتے ہیں؟"

"یہ بات بھی مینجروں اور کمداروں ہی کو معلوم ہو گی۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔"

"معاف کیجئے گا، اس دفعہ بھی مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ تو کراچی میں رہتے ہیں۔ آپ کو یہ تفصیلات کیوں معلوم ہونے لگیں۔" علیم نے سوال کیا۔ "مگر یہ تو معلوم ہو گا کہ آپ کی زمینداری میں کتنے گوٹھ اور گاؤں ہیں۔ ان میں کتنے لوگ آباد ہیں؟"

"یہ بات تو دفتر مال کے ریکارڈ سے معلوم ہو گی اور مردم شماری کرنے والوں کو اس کا پتہ ہو گا۔" داد محمد سومرو نے علیم کو بتایا۔ "ایسی اطلاعات تو مختیار کار، گرداور اور پٹواریوں کے پاس ہونی چاہئیں۔"

علیم الدین سبزواری ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "بہر حال، آپ کو یہ تو پتہ ہو گا کہ آپ کی اولادیں کتنی ہیں؟"

داد محمد سومرو بھی ہنسنے لگا۔ نشہ سے جھوم کر بولا۔ "سائیں ان کی تعداد بھی ان کی ماؤں کو معلوم

ہو گی" اس نے نوجوانوں کی طرح سینہ تان کر بڑے فخر سے علیم الدین کو دیکھا۔

"آپ کی بیگمات کتنی ہیں؟"

علیم کی بات سن کر داد محمد دیر تک ہنستا رہا، پھر اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ ہاتھ اٹھا کر بھیگی ہوئی مونچھوں کو صاف کیا۔ بے نیازی سے بولا" ان کی تعداد تو مولوی ثناء اللہ کے رجسٹر میں درج ہو گی جو نکاح پڑھاتا ہے اور طلاک دلواتا ہے۔ میں اس کو اسی کام کے لئے تنخواہ بھی دیتا ہوں۔ ویسے تو وہ میرے گوٹھ کی مسجد کا ملّا ہے۔"

دونوں اس زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسے کہ شیریں پریشان ہو کر غسل خانے کے دروازے سے جھانکنے لگی۔ دونوں کچھ دیر تک بے تکلفی سے ہنستے رہے۔

علیم نے مڑ کر غسل خانے کی جانب دیکھا۔ دروازہ اب بند ہو چکا تھا۔ اس نے داد محمد سے دریافت کیا" شکاری کتوں پر ہر سال کتنی رقم خرچ ہو جاتی ہو گی؟"

"سائیں، تم کیسی باتیں کر رہے ہو" داد محمد نے منہ بگاڑ کر کہا" اس طرح کا حساب کتاب تو میرا منشی رکھتا ہے" اس نے قدرے تامل کیا" ہاں، خوب یاد آیا۔ پچھلے سال میں نے ۵۰ ہزار روپے خرچ کر کے اپنے کتوں کے لیے بہت شاندار ڈاگ ہاؤس بنوایا تھا۔ اس کا نام ایک شاعر نے "سگ لیلیٰ" رکھا ہے کہیے پسند آیا؟ اسے دیکھئے گا تو دل خوش ہو جائے گا۔ میرے پاس ایک سے ایک اعلیٰ نسل کا کتا ہے۔ سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ ہمیشہ کتوں کی دوڑیں جیتتے ہیں اور جب ان کو لڑاتا ہوں تو چیتوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرتے ہیں" اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا" آپ نے کبھی کتوں کی لڑائی دیکھی ہے؟ ہزاروں روپے کی شرطیں لگائی جاتی ہیں۔"

"بہت خوب، کتوں کے معاملے میں آپ کا ذوق بہت بلند معلوم ہوتا ہے" علیم نے مسکرا کر تبصرہ کیا" ویسے مسٹر سومرو، آپ کے کتے بھی بڑے باذوق ہوں گے۔ کھانے کے کمرے میں کرسیوں پر بیٹھ کر نہایت سلیقے سے راتب نوش فرماتے ہوں گے۔ راہداریوں میں چہل قدمی کرتے ہوں گے۔ ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ کر سیاست پر تبادلۂ خیال کرتے ہوں گے"

"ناسائیں، آپ کی یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی" داد محمد نے منہ بگاڑ کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا "کتے اور سیاست پر بات کریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سائیں! وہ تو کتے ہوتے ہیں۔"

"معاف کیجئے گا۔ میں غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ اعلیٰ نسل کے باذوق کتے سیاست پر بھی بات کر سکتے ہیں" علیم نے کہا "آپ کہتے ہیں تو مانے لیتا ہوں۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ وہ ضرور سیاست پر گفتگو کرتے ہوں گے۔ قومی مسائل کو آپ کے اصیل کتوں سے زیادہ اور کون بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے" اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا "یہ فرمایئے۔ آپ نے بلیاں کتنی پال رکھی ہیں؟"

"بلیاں؟" داد محمد سومرو نے تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجہ میں کہا "جی میں ایسی کھکھیڑ نہیں پالتا۔ ایک بار کسی نے تحفہ میں ایک سیامی بلی پیش کی تھی۔ مگر وہ تو مدت ہوئی مر کھپ گئی۔"

"کسی شاعر نے اس کی تاریخ وفات بھی کہی ہوگی۔"

"جی نہیں۔" اس نے منہ بگاڑ کر اپنی بے زاری کا اظہار کیا "میں شاعروں واعروں سے میل ملاپ نہیں رکھتا۔"

"آپ کتے پالتے ہیں۔ شاعروں کی پرورش نہیں کرتے؟"

"ناسیئں، میں ایسا کام نہیں کرتا۔ ہاں مرغ ضرور پالتا ہوں۔ اور لمبی لمبی شرط لگا کر ان کو لڑاتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ گوٹھ چلیں۔ ادھر اسی ہفتہ مرغوں کی زبردست پالی ہوگی۔ میرے ایک مرغ پر پچیس ہزار کی شرط لگی ہوئی ہے۔"

علیم الدین ذرا دیر کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔ سومرو کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا "تو گویا مسٹر سومرو، آپ نے الکشن لڑنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔"

"جی ہاں۔ اب میں یورپ کا دورہ کرنے کے بعد واپس آ گیا ہوں" سومرو نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا "بڑے زور شور سے الکشن لڑنے کا کام ہو رہا ہے۔"

"یورپ آپ ووٹوں کی گنتی میں الٹ پھیر اور بیلٹ بکس توڑنے کے جدید طریقے معلوم کرنے گئے تھے؟"

"جی نہیں۔" اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی "آپ ایسی بات نہ کریں۔"

"آپ کہتے ہیں تو ایسی بات نہیں پوچھوں گا" علیم نے مسکرانے کی کوشش کی "مگر یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ اپنے حلقۂ انتخاب کے حکام سے آپ نے ربط و ضبط تو بڑھا ہی لیا ہو گا۔ معاف کیجئے گا، یہ بات میں نے آپ ہی کے انٹرسٹ میں کہی ہے۔"

"سائیں! آپ اُن کی فکر نہ کریں۔ اپنی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ گورنر سے صدر مملکت تک سب ہی میری شکارگاہ میں ہر سال شکار کھیلنے آتے ہیں۔ کئی کئی دن میرے مہمان رہتے ہیں۔ ویسے ضلع کے سارے ہی افسران سے ہمیشہ ہی اپنا اچھا میل ملاپ رہا ہے" داد محمد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا "سائیں، سچ پوچھو تو ان کو ساتھ ملائے بغیر الکشن جیتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ کرا سکتے ہیں۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"بالکل درست فرمایا آپ نے" علیم نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی "میں تو آپ کو یہ مشورہ دوں گا، ہو سکے تو ڈپٹی کمشنر یا ایسے ہی کسی بڑے افسر کو نئی ماڈل کی کار ضرور پیش کریں۔ اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ وہ اسے ہر وقت آپ کی یاد دلاتی رہے گی اور دیکھئے افسروں کی بیگمات کو ہرگز نہ بھولئے گا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قیمتی تحفے تحائف پہنچاتے رہیں۔"

داد محمد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا "ان کے لئے تو میں لندن سے ڈھیر سارے تحفے لایا ہوں۔ پرفیوم اور میک اپ کا سامان تو تین سوٹ کیس بھر کر لایا ہوں۔ ساڑھیاں اور دوسرے کپڑے لتے اس کے علاوہ ہیں۔"

"تیاری تو آپ نے بہت اچھی کر رکھی ہے" علیم نے مسکرا کر داد محمد کو دیکھا "عوام کو خوش کرنے کے بارے میں بھی آپ نے کچھ سوچا؟"

"عوام! وہ تو سائیں ایک دم الّو کے پٹھے ہوتے ہیں۔ ان کو تو خواہ مخواہ ووٹر بنا دیا۔ بھلا ان سے اور حکومت سے کیا کام۔"

"ویسے میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے۔" علیم الدین سبزواری نے اپنی بات پر اڑنے کی مطلق کوشش

نہیں کی۔ "سچ پوچھئے تو یہ جمہوریت دموریت سب فراڈ ہے۔" وہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسا۔ "یہ تو عوام کو بے وقوف بنانے کا چکر ہے۔"

داد محمد اس بار خاموش رہا۔ اس نے خالی گلاس میں وہسکی ڈالی۔ پانی ملایا اور ہونٹوں سے لگا کر آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

"الکشن سے پہلے باقاعدہ منصوبہ بندی کر لیجئے گا۔" علیم زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا۔ "مثلاً یہ کہ فی ووٹر کیا ریٹ مقرر کیا جائے۔ ان کے کھانے پینے اور نشے پانی کا کس طرح بندوبست کیا جائے۔ مخالف امیدواروں کو کس طرح جھوٹے مقدموں میں پھنسایا جائے۔ ان کے کارکنوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے مسلح حملے کس کس موقع پر کئے جائیں۔ ہو سکے تو ایک آدھ کو قتل بھی کرا دیا جائے۔ مطلب یہ کہ ایسی دہشت گردی پھیلا دی جائے کہ دوسرے امیدواروں کے پولنگ ایجنٹ تک خوف زدہ ہو جائیں۔ آپ کے بوگس ووٹ کو چیلنج کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔ "اپنے غنڈوں اور کارندوں کی ٹریننگ تو آپ نے ابھی سے شروع کرا دی ہوگی۔"

"سائیں، اپنے کو پچھلے الکشنوں کا بہت تجربہ ہے۔" داد محمد نے مسکرا کر بتایا۔ "اس دفعہ تو ایسی ایسی نئی ٹکنک استعمال کروں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔" اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ "اب آپ سے کیا چھپانا۔ جس روز الکشن کا اعلان ہوا۔ اسی روز سے کام کرنے والوں کی بھرتی شروع کر دی تھی۔ زبردست ٹیم بنائی ہے۔ ان کو ٹریننگ دینے کے لئے میں نے ایک علیحدہ بنگلہ دے رکھا ہے۔ کھانے کا، پینے کا، لیٹنے بیٹھنے کا ہر طرح کا انتظام ہے۔"

"یہ تفصیلات بتا کر تو آپ نے دل خوش کر دیا۔" علیم الدین سبزواری نے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ اس حلقۂ انتخاب سے مسلم لیگ کا ٹکٹ تو آپ کو مل ہی جائے گا؟"

"کیا کہا، مجرم لیگ؟" بھورے خاں نے مداخلت کی۔ "اماں، پھر تو الکشن لڑنے کا ٹکٹ مجھ کو ملنا چاہیئے۔ ورنہ میں ایک ایک کی ایسی کی تیسی کر دوں گا۔ میں نے آٹھ بار جیل کاٹی ہے، آٹھ بار۔ کیا سمجھے؟"

"تم کو ٹکٹ کیسے مل سکتا ہے۔" علیم الدین نے بھورے خاں کو ڈانٹا۔ "تم، سومرو صاحب کا کیا مقابلہ

کر سکتے ہو۔ دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ تمہارا کام جیل جانا ہے اور ان کا کام جیل بھجوانا ہے۔"

"اماں، تم کو یہ بھی خبر ہے۔ میں شاہجہاں پور کا رہنے والا ہوں۔" بھورے خاں نے تڑپ کر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ "پانچ قتل کئے ہیں اب تک۔ قتل ہی کے ایک مقدمہ میں جیل کاٹ رہا تھا کہ فرار ہو کر ادھر آگیا۔ سچ پوچھو تو پاکستان کی محبت کھینچ لائی۔"

علیم الدین نے اس کی بات پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا بڑا اور داد محمد سومرو کی جانب متوجہ ہوا۔ "مسٹر سومرو جنگلی سؤر کے شکار میں پچھلے سال آپ کی بندوق سے کتنے آدمی ہلاک ہوئے ہوں گے؟ اس سال تو آپ یورپ کا دورہ کر رہے تھے۔"

"چھ سات ہاری تو ایسی بیگار میں مرے ہی ہوں گے۔" داد محمد سومرو نشے سے جھوم کر بولا۔ "مگر آپ یہ بات کس لئے پوچھ رہے ہیں؟"

"یہ تو میں آف دی ریکارڈ پوچھ رہا ہوں۔" سبزواری نے اس کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔ "آپ اطمینان رکھیئے۔ میں تھانے میں جا کر آپ کے خلاف رپورٹ درج نہیں کراؤں گا۔"

"ارے یار کروا بھی دوگے تو میرا کیا بگاڑ لوگے۔" سومرو نے خمار آلود نظروں سے علیم کو دیکھا۔ "تھانیدار اپنا ہی آدمی ہے جتنی حکومت سے تنخواہ لیتا ہے۔ اس کا دوگنا میں اسے ہر مہینے بھتہ دیتا ہوں۔ تم نے میرے خلاف کارروائی کرنے کی کوشش کی تو الٹا تمہارے خلاف کیس بنا دے گا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ بخوبی معلوم ہے مگر یہ آپ کو ابھی پتہ چل جائے گا کہ میں آپ سے یہ بات کیوں پوچھ رہا تھا۔" علیم نے صفائی پیش کی۔ گردن گھما کر بھورے خاں کو مخاطب کیا: "سن رہے ہو بھورے خاں چھ سات قتل اور وہ بھی صرف شکار کے سلسلہ میں یہ صرف ایک سال کا اسکور ہے۔"

"اور میں چوریاں جو کرتا ہوں، ڈاکے ڈالتا ہوں اور جتنے کیا کیا کرتا ہوں۔ تم کو کیا پتہ میرے کتنے اور کیا کیا مال مسالہ ہے۔" بھورے خاں مرعوب نہ ہوا۔

"تم نے کبھی اللہ ڈینو کھوسو ڈاکو کا نام سنا ہے؟" علیم نے بھورے خاں سے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں سنا۔ اماں، اسے کون نہیں جانتا۔ وہ تو بڑا نامی گرامی ڈاکو ہے۔ اس سے تو پولس

والوں کی بھی۔" بھورے خاں نے بھڑ سے گالی دی۔" ایسا دھاکڑ ہے کہ پہلے سے اعلان کر کے ڈاکہ ڈالتا ہے۔" اس نے تامل کیا۔" پتہ نہیں میرا یار ایکا ایکی کہاں غائب ہوگیا۔"

"مگر تم کو یہ نہیں معلوم کہ وہ سومرو صاحب کا پروردہ تھا۔ ہر واردات کے بعد سومرو صاحب کی حویلی ہی میں روپوش ہوتا تھا۔" علیم نے بھورے خاں کو مطلع کیا۔" وہ غائب وائب کہیں نہیں ہوا۔ ایک روز سومرو صاحب کی حکم عدولی کی۔ ایسے ناراض ہوئے کہ اسی وقت گولی سے اڑا دیا۔ لاش اس طرح ٹھکانے لگوائی کہ آج تک سراغ نہ ملا۔"

"اماں، تم کیا کہے رہے ہو؟ کھو سو ڈاکو کو گولی سے اڑا دیا۔" بھورے خاں نے حیران و پریشان ہو کر پہلے علیم کو دیکھا پھر داد محمد سومرو کو جو گلاس ہونٹوں سے لگائے وہسکی کی چسکی لگا رہا تھا۔

علیم نے بھورے خاں کو ڈانٹا۔" آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا۔ تم تو بہت معمولی قسم کے جرائم پیشہ ہو۔ فی الحال اپنی چونچ بند رکھو اور اطمینان سے شراب پیو۔"

بھورے خاں نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور گلاس اٹھا کر وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ نہ اس نے داد محمد سومرو کی جانب توجہ دی، نہ علیم الدین سبزواری کو مڑ کر دیکھا۔

علیم نے داد محمد کو مخاطب کیا۔" مسٹر سومرو، آیئے اب آپ سے کچھ اور باتیں ہو جائیں۔"

"سائیں، آپ تو بہت دور بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس نے خمار آلود نظروں سے علیم کو دیکھا۔" میری آواز آپ سن رہے ہیں؟" وہ چیخ چیخ کر بولنے لگا۔" اب تو آپ بالکل ٹھنگنے نظر آرہے ہیں۔ اتنے ذرا سے معلوم ہو رہے ہیں کہ مجھے دوربین لگا کر دیکھنا پڑے گا۔"

داد محمد سومرو، نشے سے مدہوش ہو کر بہکنے لگا تھا۔

علیم الدین سبزواری نے اسے اس عالم میں دیکھا تو مسکرا کر بولا۔" کچھ دیر بعد دیکھئے گا تو میں مچھر بن کر اڑن چھو ہو جاؤں گا۔"

"کیا کہا۔ آپ مچھر بن کر اڑ جائیں گے۔" داد محمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر علیم کو دیکھا۔" یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ابھی، آپ خود دیکھ لیجئے گا" علیم نے اسے چھیڑا " اس طرح پھُر سے اڑ جاؤنگا کہ آپ دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جائیں گے"

داد محمد سومرو، خوف زدہ ہو کر صوفے کے بازو سے چمٹ گیا۔ اب وہ نشہ سے چور ہو چکا تھا۔ جسم بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ نظریں بھٹک رہی تھیں۔

بھورے خاں کی بوتل خالی ہو چکی تھی مگر وہ ابھی سیر نہ ہوا تھا۔ مزید پینے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور داد محمد کے برابر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ داد محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ سہما ہوا بیٹھا رہا اور اپنی گول، گول آنکھوں سے علیم الدین کو تکتا رہا۔

بھورے خاں نے پہلے اپنے گلاس میں وہسکی انڈیلی، پھر داد محمد کے گلاس میں ڈالی۔ جگ سے پانی ملایا۔ گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ گھونٹ بھر کر بولا "قسم اللہ کی، آج تو جوانی کا مزہ آگیا۔ اصلی ولایتی ہے۔ جتنی پیئو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے" اس نے خوب بڑا سا گھونٹ بھرا نشے کی ترنگ میں گنگنانے لگا۔

"یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں"

اس کی آواز بھونڈی اور کرخت تھی۔ وہ وہسکی کی چسکی لگا رہا تھا اور جھوم، جھوم کر ایک ہی مصرعہ الاپ رہا تھا۔ علیم تو خاموش بیٹھا اسے نشے سے بہکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مگر داد محمد سومرو کو اس کا اس طرح بے سرے پن سے گنگنانا سخت ناگوار معلوم ہوا۔ اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر بھورے خاں کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔

"بند کر اپنی یہ بکواس۔"

بھورے خاں مطلق مرعوب نہ ہوا۔ مڑ کر سومرو کو دیکھا۔ بے تکلفی سے مسکرا کر گویا ہوا "پیارے اتنے خفا کیوں ہو رہے ہو" اس نے دوسرا گلاس اٹھا کر داد محمد کی جانب بڑھایا "لو، ذرا سی اور لگالو۔" اس نے دوسرا گلاس داد محمد کی نظروں کے سامنے ہوا میں ہلایا "اماں، دیکھو تو کیسی سنہری پری کی طرح چھا چھم جھلملا رہی ہے" بھورے خاں جھوم جھوم کر گنگنانے لگا "پی لے پی لے موے راجہ!"

داد محمد سومرد کو اس کی بے تکلفی نہایت شاق گزری۔ اس نے جھنجھلا کر ہاتھ مارا۔ گلاس چھلکا اور رم کی کے چھینٹے صوفے پر ادھر ادھر بکھر گئے۔

بھورے خاں نے پھر بھی بُرا نہ مانا۔ ڈھٹائی سے ہنس کر بولا "یار تو، تو ہتھے سے اکھڑا جا رہا ہے۔ جانِ من! اتنا نخرا اچھا نہیں ہوتا۔ میری خاطر تھوڑی سی اور لگا لے۔"

داد محمد ایک دم بھڑک اٹھا۔ غصہ سے دھاڑا "تم سالے ٹکے کے آدمی، تمہاری یہ جرأت کہ تم ہمارے ساتھ بیٹھ کر شراب پیئو۔ اٹھو، یہاں سے دور ہو جاؤ۔"

بھورے خاں گھبرا کر بوٗنق کی طرح اس کا چہرہ تکنے لگا۔ داد محمد نے اسے ڈانٹا "تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔" وہ جھنجھلا کر اس کی جانب جھپٹا۔

بھورے خاں نے حیران و پریشان ہو کر ایک گلاس فوراً میز پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگا کر تھوڑی سی رم کی پی۔ خوشامد کرنے کے سے انداز میں گویا ہوا "اماں اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہو؟ میں نے تم کو گالی تو نہیں دی۔ صرف تھوڑی سے لگانے ہی کو تو کہا تھا۔"

داد محمد سومرد بگڑ کر بولا "تم الو کے پٹھے ہو۔"

بھورے خاں نے پھر بھی کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ بے حیائی سے مسکراتا رہا۔

"سور کے بچے تم یہاں سے دور ہو جاؤ" داد محمد اور بھی زیادہ برہم ہو کر چیخا۔ "ایک لات ماروں گا یہاں سے وہاں تک لڑھکتے چلے جاؤ گے۔"

بھورے خاں ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ اس کا گلاس اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ جھکا اور بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ داد محمد نے جھٹ بوتل اٹھالی۔ قہر آلود نظروں سے گھور کر بولا "یہ تمہارے باپ کا مال ہے۔ چور حرامی، کتیا کا پلّا۔"

بھورے خاں اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا "کیا کہا تم نے حرامی؟ یعنی میں حرامی ہوں۔ کتیا کا پلا ہوں۔ میری ماں کتیا تھی۔ تم نے میری مری ماں کو گالی دی ہے، جو اتنی نیک تھی کہ سجدے میں اس کا دم نکلا تھا۔ ہائے میری اماں۔" وہ منہ بسور کر رونے لگا۔

علیم الدین سبزواری اطمینان سے بیٹھا آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور دونوں کو نشے کے عالم میں بہکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ عین اس وقت شیریں نے غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ باہر نکلی، کھڑکی کے پردے سے جسم کو ڈھانپے ہوئے جھکی جھکی آگے بڑھی اور دبے دبے قدموں سے چلتی ہوئی داد محمد سومرو کے عقب میں پہنچی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر داخل ہو کر بند کر لیا۔

بھورے خان منہ بسور بسور کر روتا رہا۔ داد محمد سومرو کو اس کا رونا نہایت گراں گزرا۔ ڈپٹ کر بولا۔ تم یہاں شور کیوں مچا رہے ہو۔ اُلو کے پٹھے۔ فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

بھورے خاں نے رونا بند کر دیا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ جھٹ اپنی گندی جیکیٹ جانگیہ کے نیفے سے ٹٹول کر چاقو نکالا۔ اسے کھولا۔ چاقو کا تیز پھل، روشنی میں چاندی کے تار کی مانند جھلکنے لگا۔ چاقو دیکھ کر، داد محمد سومرو گھبرا گیا۔ علیم بھی پریشان ہو گیا۔ معاملہ اب نازک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بھورے خاں چاقو ہاتھ میں دبا کر داد محمد سومرو کی جانب بڑھا۔ علیم فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔ لپک کر بھورے خاں کے قریب پہنچا اور جھپاک سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

بھورے خاں نے مڑ کر علیم الدین سبزواری کی جانب دیکھا۔ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی بگڑ کر بولا "تم اس معاملہ میں نہ بولو۔" اس نے خونخوار نظروں سے داد محمد سومرو کو دیکھا۔ "یہ سالا وڈیرا خود کو سمجھتا کیا ہے۔ اس نے میری ماں کو گالی دی ہے۔" اس نے جھٹکا دے کر علیم کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "ایک ہی ہاتھ میں سالے کی انتڑیاں باہر نکال دوں گا۔"

وہ بپھر کر داد محمد پر جھپٹا، جو خوف سے آنکھیں پھاڑے، صوفے کی پشت سے چمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ علیم نے ہمت سے کام لیا۔ بھورے خاں کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ نرم لہجے میں بولا "بھورے خاں، میری بات تو سنو، اتنا غصہ کرنا اچھا نہیں ہوتا۔" علیم اسے منانے لگا۔ "آؤ میرے ساتھ۔ اطمینان سے بیٹھ کر جتنی پینا چاہتے ہو پیو۔ کوئی مائی کا لال تم کو نہیں روک سکتا۔"

بھورے خاں نشے سے جھوم رہا تھا مگر اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر بپھرا۔ "اس سالے وڈیرے کو آسانی سے تو نہیں چھوڑوں گا۔ جنے کتنے ایسے طرم خاں دیکھے ہیں۔"

وہ چاقو سنبھال کر داد محمد کی جانب پلٹا۔" یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کوئی بھورے خاں ملا تھا۔ تم کہتے ہو تو اس کو جان سے نہیں ماروں گا مگر اس کا ایک کان تو ضرور کاٹوں گا۔ ساری ہیکڑی نکل جائے گی۔"

"غصہ تھوک دو۔" علیم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔" کان کاٹ کر کیا کرو گے؟"

"نہیں بڑے بھائی، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا ایک کان کاٹوں گا اور ابھی تمہارے سامنے کاٹوں گا۔ وسے لے جا کر اسپرٹ کی بوتل میں سنبھال کر رکھوں گا۔" بھورے خاں اپنی ضد پر اڑا رہا، جس سے اپنی چیخ جاتی ہے۔ اس سالے کا کان کاٹے بغیر نہیں چھوڑتا۔ تم کو جو بھی ایک کان کٹا ہو ملے سمجھ لینا اس نے میرے سامنے داؤ کیا تھا اور اس کا نتیجہ بھی بھگت لیا۔ دوسرے تو بدلہ لینے کے لئے ناک کاٹ لیتے ہیں۔ مگر میں نکٹے کے بجائے کن کٹا بنا دیتا ہوں۔"

"مگر یہ تو سوچو، اس کا انجام کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا، زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کی سزا ہو جائے گی۔ پھانسی پر تو نہیں چڑھا دیا جاؤں گا۔" بھورے خاں نے نڈر ہو کر جواب دیا۔" برسوں جیل کاٹی ہے چھ مہینے کی اور کاٹ لوں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ ایک بار پھر داد محمد کی طرف چاقو اٹھا کر جھپٹا۔ علیم نے نہایت ہوشیاری سے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹایا۔ داد محمد سومرو خوف زدہ ہو کر اور سکڑ گیا۔ وہ سخت ہراساں نظر آ رہا تھا۔ ادھر بھورے خاں کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی طور علیم کے قابو ہی میں نہ آ رہا تھا۔ نشہ سے جھوم کر بار، بار داد محمد پر جھپٹتا۔ علیم روکنے کی کوشش کرتا۔ بھورے خاں ایک بار پھر داد محمد پر جھپٹا تو نشہ کی جھونک میں خود کو سنبھال نہ سکا۔ لڑکھڑا کر دھڑام سے فرش پر گرا۔ کھلا ہوا چاقو ہنوز اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

داد محمد سومرو خوف سے تھر تھرا رہا تھا۔ علیم الدین سبزواری بھی سہما ہوا تھا۔ اسے بھی خدشہ تھا کہ نشے کی دھن میں بھورے خاں کہیں چاقو سے اس پر وار نہ کر بیٹھے مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ بھورے خاں کو سمجھا بجھا کر نرم کیا۔ میز پر رکھا ہوا وہ گلاس اٹھایا جس میں وہسکی تھی۔ گلاس سنبھال کر بھورے

خاں کے پاس آیا۔ بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بھورے خاں نے گلاس منہ سے لگا کر بڑا سا گھونٹ بھرا اور جھومتا جھامتا ایک بار پھر اپنی جگہ پہ جا کر بیٹھ گیا۔

وہ چپ چاپ بیٹھا وسکی سے شغل کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بلا کی کرختگی چھائی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں بجّو کی طرح چمک رہی تھیں۔ داد محمد سومرو ابھی تک سہما ہوا تھا۔ علیم الدین سبزواری بھی گم صم تھا۔ کمرے کے اندر خوف ناک سناٹا چھایا تھا۔ ہر شخص خاموش تھا۔ کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔ باہر ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ درختوں کی شاخوں سے الجھتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ بارش کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ موٹی موٹی بوندیں کھڑکیوں کے شیشوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

بھورے خاں دفعتاً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلاس منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پورا چڑھا گیا۔ پھر اس نے خالی گلاس پختہ فرش پر دے مارا۔ زور کا چھناکا ہوا۔ شیشوں کے ٹکڑے دور تک بکھر گئے۔ کمرے میں سنسنی پھیل گئی۔ داد محمد سومرو کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ علیم الدین سبزواری نے سراسیمہ ہو کر سوچا۔ دیکھو! اب کیا نئی آفت نازل ہوتی ہے۔ بھورے خاں نشہ میں دھت ہو رہا تھا اور اس کا پارہ بھی چڑھا ہوا تھا۔

مگر کوئی آفت نازل نہ ہوئی۔ بھورے خاں نے مڑ کر علیم کو دیکھا مسکرا کر بولا۔ "اچھا بڑے بھائی اب ہم چلے۔"

علیم نے کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی دہشت ناک تاریکی کو دیکھا، سوچا برسات کی اس طوفانی رات میں یہ کہاں جائے گا۔ اس نے بھورے خاں کو روکنے کی کوشش کی۔ "ابھی تو بڑی زور کی بارش ہو رہی ہے۔ اتنے خراب موسم میں کہاں جاؤ گے؟"

داد محمد سومرو کو علیم کا رویّہ نہایت شاق گزرا۔ وہ بھورے خاں سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر علیم کو تیکھی نظروں سے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

بھبو رے خاں نے بے نیازی سے کہا: "اماں، تم میری فکر نہ کرو، بھیگتا بھاگتا چلا ہی جاؤں گا۔"

"میں واپس کراچی جاؤں گا۔" علیم نے اسے مطلع کیا: "میرے پاس اپنی جیپ ہے۔"

"اُدھر جانے کو تو اپنا بھی جی چاہتا ہے۔" بھبورے خاں نے نشہ سے جھوم کر کہا: "ٹھکانہ بھی اپنا لالوکھیت ہی میں ہے۔ لیکن تھانے کا ایس ایچ او میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ سالے نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ اسی سے ہی تو جان بچا کر ادھر آیا ہوں۔"

"کوئی سنگین واردات کی ہوگی۔" علیم الدین نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

"اماں ایسی کوئی بات نہیں۔" بھبورے خاں نے بتایا: "وہ تھانے میں بلا کر بار بار کہتا ہے کہ جوئے کا اڈہ چلاؤ۔ جیتنے والوں سے نال وصول کرو اور اس کا آدھا حصہ تھانے میں پہنچاؤ۔ دوسروں کی مخبری بھی کرو۔" اس نے منہ بگاڑ کر علیم کو دیکھا۔ "بھیا خاں! بات اصلی یہ ہے کہ میں نے کبھی یہ دھندا کیا نہیں۔ سیدھی سیدھی چار سو بیسی ہوتی ہے۔ اپنا کام تو کھرا کھیل فرخ آبادی ہے۔ کون اس چکر میں پڑے۔ میں نے تو صاف انکار کر دیا۔ بس اسی بات پر وہ خفا ہو گیا۔ پہلے تو دھونس دھمکی دیتا رہا پھر قتل کے ایک مقدمے میں مجھے پھانسنے کی کوشش کی۔"

علیم نے ایک بار پھر اسے روکنے کی کوشش کی: "کراچی نہ جانا۔ راستے میں جہاں کہو گے چھوڑ دوں گا۔"

اس نے علیم سبزواری کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر زہرخند ہویدا ہوا۔ کہنے لگا۔ "اور جو تم مجھے لے جا کر تھانے پہنچا دو۔ کیوں استاد! یہ ٹرکیں اور وہ بھی یاروں سے۔"

"ایسا کروں تو میرا ابھی ایک کان کاٹ کر اسپرٹ کی بوتل میں ڈال دینا۔"

"اماں تم نے میری بات کا یقین بھی کر لیا۔ بھئی حد ہو گئی۔ میں تو اس سالے وڈیرے کو ڈرانے کے لئے کہہ رہا تھا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ داد محمد سومرو کو دیکھا جو صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ "اسپرٹ تو پینے کی چیز ہوتی ہے۔ جب نشے پانی کا کوئی سبیتا نہیں ہوتا تو اسپرٹ ہی سے اپنا کام چلتا ہے۔ میں اس سالے کا کٹا ہوا کان ڈال کر پوری بوتل خراب کروں گا۔" اس نے ایک خمار آلود نظر علیم پر ڈالی۔ "اچھا بڑے بھائی

بہت ہو چکی یاری۔ میں تو اب چلا۔"

علیم نے مزید کچھ نہ کہا۔ بھورے خاں آگے بڑھا۔ داد محمد سومرو کے قریب پہنچا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک پکڑی۔ اسے بے تکلفی سے ادھر ادھر ہلایا۔ آنکھ مار کر بولا "عیش کرو پیارے عیش۔ آنکھوں پر دوربین چڑھا کر جوبن کی بہار دیکھو۔ اصلی جاپانی واکہیڈ۔ تمہاری قسمت میں تو عیش ہی کرنا لکھا ہے۔" داد محمد نے مطلق مزاحمت نہ کی۔ دم سادھے بیٹھا رہا۔

بھورے خاں نے داد محمد سومرو کی ناک چھوڑ دی۔ مڑا کھڑکی کی جانب لپکا۔ زور سے "یا علی مدد" کا نعرہ لگایا۔ زقند بھر کر کھڑکی کی چوکھٹ پر پہنچا اور چھلاوے کی مانند رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

داد محمد سومرو سہمی ہوئی نظروں سے برابر کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ الو کی طرح گول گول آنکھیں نکالے صوفے پر سکڑا سکڑایا، وہ بالکل کارٹون معلوم ہو رہا تھا۔ علیم الدین اسے دیکھتا رہا اور منہ بگاڑ بگاڑ کر زیر لب مسکراتا رہا۔

چند لمحے بعد جب داد محمد نے مڑنے کے لئے پہلو بدلنے کی کوشش کی تو علیم نے فوراً ٹوکا "بس مسٹر سومرو بس ذرا دیر اور اسی طرح بیٹھے رہیئے۔"

داد محمد سومرو نے حیران و پریشان ہو کر علیم کی طرف دیکھا۔ پوچھا "تمہارے پاس کیمرہ تو نہیں ہے؟"

علیم نے خاموشی سے جیب کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ایک کاغذ نکالا اور اسے کھول کر داد محمد کے سامنے کرتے ہوئے بولا "فی الحال تو میرے پاس یہ چیک موجود ہے۔"

"کیسا چیک؟" داد محمد اس کی بات کا مفہوم بالکل نہ سمجھ سکا۔ احمقوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"یہ وہ چیک ہے جو آپ نے اپنے بیان کے ساتھ 'ندائے وطن' کے ایڈیٹر کو بھیجا تھا۔" علیم الدین سبزواری نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "آپ کو اس چیک کے بارے میں علم تو ہو گا؟"

"یاد آتا ہے یہ چیک بھجوایا تو گیا تھا مگر میں اس کا کیا کروں گا؟"

"آپ تو اس کا کچھ نہیں کریں گے، البتہ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے بیان کے ساتھ اس کا عکس بھی اخبار میں شائع کر دیا جائے۔"

"کیوں؟" داد محمد نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ "آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟"

"تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ سیاسی رشوت کیا ہوتی ہے؟"

"آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔" داد محمد سومرو حواس باختہ ہو گیا۔

"اس کا اندازہ آپ کو پرسوں کے 'ندائے وطن' سے ہو جائے گا۔" علیم نے مسکرا کر کہا: "اطمینان رکھیے اسے صفحہ اول ہی پر شائع کیا جائے گا اور نہایت نمایاں طور پر بوکس بنا کر شائع کیا جائے گا۔"

"آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں۔ کس لئے کر رہے ہیں؟" داد محمد سومرو اور زیادہ پریشان ہو گیا اس کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔

"اس لئے کہ آپ نے میری اور میرے اخبار کی سخت توہین کی ہے۔"

"توہین؟ سائیں، تم کیسی بات کر رہے ہو۔" وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا اور بے حد ہونق نظر آ رہا تھا۔

علیم الدین، اس کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اطمینان سے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا چند لمحے اس نے تامل کیا پھر گویا ہوا: "مسٹر سومرو! آپ 'ندائے وطن' کو اتنا معمولی اور چھیچھڑا اخبار سمجھتے ہیں کہ صرف چار سو کی رقم کے عوض آپ کا پروجیکشن کرے گا پبلسٹی کرے گا۔ کسی موقر اخبار کی اس سے زیادہ اور کیا توہین ہو سکتی ہے۔"

"سائیں، تو پھر ایسی بات کریں نا۔ آپ نے تو خواہ مخواہ مجھے پریشان کر دیا" داد محمد سومرو نے اطمینان کی سانس لی۔ مسکرایا۔ نرم لہجہ میں بولا: "ناراض نہ ہوں اگے اور روپیہ بھی مل جائے گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ رقم کا تعین ابھی اور اسی وقت ہو جائے۔"

"آپ ہی بتا دیں۔ مجھے تو کچھ اتا پتا نہیں۔"

دونوں اب سودے بازی کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے۔ علیم الدین سبزواری نے مطالبہ کیا۔ "فی الحال بیس ہزار روپے آپ کو دینا ہوں گے اور یہ پہلی قسط ہو گی جب الکشن کی حتمی تاریخ مقرر ہو جائے گی تو اتنے ہی روپے کی دوسری قسط ادا کرنا ہو گی۔" اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ "اس کے صلے میں دندائے وطن، آپ کا ایسا موثر پروپیگنڈا کرے گا کہ ہر طرف دھوم مچ جائے گی۔"

"سائیں۔ یہ تو تم بہت مانگ رہے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ ۲۰ ہزار کی رقم زیادہ نہیں۔"

"مسٹر۔ یہ آپ کا خیال ہے۔" داد محمد نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرے خیال میں تو یہ نہ صرف زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے۔ بیس ہزار روپے بہت ہوتے ہیں۔"

"اتنی رقم تو آپ صرف ایک ریس میں ہار جاتے ہیں۔"

داد محمد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ تیکھے لہجہ میں بولا۔ "دیکھئے۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس کے وجود میں چھپا ہوا جاگیردارانہ طمطراق اچانک بیدار ہو گیا۔ "معاف کیجئے گا۔ میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

علیم الدین کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ داد محمد سومرو اب مدہوش نہیں تھا۔ بھورے خاں نے چمکتا دمکتا چاقو دکھا کر اس کا نشہ اڑا دیا تھا۔ علیم نے سوچا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ کہیں ایسا نہ ہو کر بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "آپ خواہ مخواہ برا مان گئے۔ میرا مطلب وہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"آپ کا مطلب کچھ بھی ہو، مگر میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے معاملات میں نہیں طے کرتا۔" داد محمد سومرو کے لہجے سے ہنوز خفگی آشکارہ تھی۔ "ایسے ہی کاموں کے لئے میں نے پرائیویٹ سیکرٹری رکھا ہے۔ منیجر اس کے علاوہ ہیں۔"

"معاف کیجیے گا چیک پر دستخط تو پرائیویٹ سیکرٹری کے نہیں، آپ کے ہیں" علیم نے اس دفعہ نیا الجھر پھینکا۔

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ داد محمد تلملا کر بولا "میں پہلے ہی انکار کر رہا تھا، مگر وہ بھڑوا سیکرٹری نہ مانا۔ میرے دستخط کرا کے چیک جاری کرا دیا۔" وہ غصے سے بڑبڑانے لگا "میں اس حرام زادے نارکچو کو فوراً نکال دوں گا۔"

"ایسا نہ کیجیے گا۔ میں اس سے مل چکا ہوں۔ بہت ہوشیار اور کام کا آدمی ہے"۔ علیم نے اسے رام کرنے کی کوشش کی "چلیئے جو ہو گیا، اسے بھول جایئے۔ آپ کو بیس ہزار زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اٹھارہ ہزار کر دیجیے۔ یہ تو زیادہ رقم نہیں ہے"۔

"نہیں سائیں، یہ بھی زیادہ ہے" داد محمد ایک بار پھر سودے بازی کے موڈ میں آگیا "آپ بہت زیادہ مانگ رہے ہیں"۔

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے۔ پچھلے ہی مہینے مجھے خان آف قلات کے دربار میں باریابی کا موقع ملا تھا۔ بڑی محبت سے ملے۔ عزت سے پیش آئے۔ ملکی سیاست کے بارے میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوا تو ان کے سیکرٹری نے زادِ راہ کے علاوہ ایک لفافہ میں مبلغ چار ہزار روپے بھی دیئے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ یہ چار ہزار کس مد میں دیئے گئے ہیں۔ جواب ملا۔ یہاں کا یہ قدیم دستور ہے۔ خان کے دربار سے کوئی اخبار نویس خالی ہاتھ نہیں جاتا۔" علیم سنبھل سنبھل کر بولتا رہا "ذرا غور تو کیجیے نہ میں نے ان کا کوئی انٹرویو لیا۔ نہ بیان اور چار سو نہیں چار ہزار روپے دے دیے۔ کسی نے سچ کہا ہے بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔ خان ہیں۔ چار ہزار کیا چالیس ہزار روپے بھی دیں تو کم ہے" داد محمد نے مسکرا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا "مگر میں تو اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں"۔

"کیوں کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں"۔ علیم نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

"آپ بھی بڑے آدمی ہیں۔ باغات اور شکار گاہ کے علاوہ کوئی بیس ہزار ایکڑ سے اوپر تو آپ کی بھی زرعی اراضی ہوگی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

داد محمد سومرو اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا "یہ بتائیں، آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں، اپنا یہ چیک اپنے پاس رکھیں" علیم نے کھل کر بات کی "چیک بک نکالیں اور اٹھارہ ہزار کا نیا چیک کاٹ دیں۔"

"میں آپ کو پندرہ ہزار دے سکتا ہوں۔ یہ روپے بھی آپ کو کل پرسوں ملیں گے۔ میرے پاس اس وقت چیک بک نہیں ہے" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

علیم الدین پرانا گھاگ تھا۔ اس نے داد محمد سومرو کو نکل بھاگنے کا موقع نہ دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے برابر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیب سے فونٹن پن نکالا۔ اسے کھولا اور داد محمد کے ہاتھ میں دے دیا۔ چیک اس کے سامنے میز پر رکھ دیا مسکرا کر کہا "ایسا کیجئے۔ چیک پر درج چار سو کی رقم کو پندرہ ہزار بنا دیں۔ اور اس کے ساتھ اپنے دستخط بھی کر دیں۔ آپ کو فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بنک سے میں نمٹ لوں گا۔"

"نہیں سائیں، یہ ٹھیک نہیں۔" داد محمد آمادہ نہ ہوا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا، پھر اس نے بے چینی سے پہلو بدلا کہنے لگا "میرے سوٹ کیس میں کچھ روپیہ پڑا ہے۔ پانچ ہزار ہوگا۔ وہ میں آپ کو ابھی دے دیتا ہوں۔ دس ہزار کل میرا سیکرٹری آپ کے دفتر پہنچا دے گا۔ میں اسے فون پر کل صبح ہی ہدایت کر دوں گا۔" اس نے نظر بھر کر علیم کو دیکھا "یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

علیم تذبذب میں پڑ گیا۔ داد محمد نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا دائیں ہاتھ کے ایک دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

علیم نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ چند لمحہ بعد اس نے چیک اٹھا کر دیکھا۔ اس پر ۲۰ اگست ۱۹۵۸ء کی تاریخ درج تھی۔ تاریخ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ اس کی بے چین نظریں بار بار اس دروازے کی سمت اٹھ جاتیں جسے کھول کر داد محمد اندر گیا تھا۔ کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔

ہوا درختوں کی شاخوں میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بارش کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

آخر کمرے کا دروازہ کھلا۔ داد محمد سومرو باہر آیا مگر وہ پریشان اور جھنجھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔ علیم نے اسے پریشان دیکھا، تو خود بھی پریشان ہوگیا۔ داد محمد اس کے قریب پہنچا اور نڈھال ہوکر صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ اس کے چہرے سے غم و غصہ صاف عیاں تھا۔

علیم نے جھجکتے ہوئے پوچھا: "خیریت تو ہے؟"

"کدھر گیا، وہ حرام زادہ چور۔" داد محمد غصے سے پھٹ پڑا۔ "کہتا تھا، اس نے صرف تجوری کھولی تھی۔" اس کے چہرے پر خشونت چھاگئی۔ "سوٹ کیس سے سب نکال کر لے گیا۔ کچھ بھی نہیں چھوڑا۔" وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو غصے سے تلملا کر بولا: "لیکن میں بھی اسے نہ چھوڑوں گا۔ جیل میں بند کراؤں گا۔ ہاتھ آگیا تو گولی ماردوں گا۔ صاف اڑالے گیا۔ ایک ایک پیسہ لے گیا۔"

علیم اس کی باتیں سن کر چکرا یا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ بھورے خاں اس قدر اونچا کلا کار تھا۔ پانچ ہزار سے اوپر رقم چرائی اور نہایت اطمینان سے بیٹھ کر دھمکی کی چسکی لگائی نہ جھجکا، نہ گھبرایا بلکہ نہایت دھڑلے سے دھونس اور دھمکی بھی دیتا رہا۔

علیم نے دبی زبان سے اپنے شبہ کا اظہار کیا: "مگر اس نے اتنی بڑی رقم رکھی کہاں؟"

"اپنی چڈی بھڈی میں سالے نے چھپا رکھی ہوگی۔" داد محمد نے جل کر جواب دیا۔ "ایک نمبر کا پکا چور تھا۔" وہ گلہ کرنے لگا: "سائیں تم نے بھی ذرا نہ سوچا۔ اس سے یاری دوستی شروع کردی۔ بدمعاش میری آدھی سے زیادہ دھسکی کی بوتل بھی چڑھا گیا۔ تم نے روکنے کے بجائے کہا۔ پیو اور پیو۔"

"میں نے تو یہ سب کچھ آپ ہی کی خاطر کیا تھا۔" علیم نے جھٹ صفائی پیش کی۔ "آپ نے دیکھا نہیں اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ بار بار آپ پر حملہ کرنے کے لئے جھپٹتا تھا۔ غصہ میں مجھ پر بھی وار کرسکتا تھا۔ مگر میں نے خطرے کی ذرا پرواہ نہ کی۔ اپنی جان پر کھیل کر بڑی مشکل سے تو اسے باز رکھا تھا۔ سب کچھ آپ کے سامنے ہی تو ہوا تھا۔"

داد محمد کچھ نہ بولا۔ اس نے خالی گلاس میں وہسکی ڈالی۔ جگ اٹھا کر پانی ملایا۔ گلاس منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں نصف سے زیادہ خالی کر دیا۔ علیم خاموش بیٹھا رہا۔ داد محمد سومرو وہسکی سے شغل کرتا رہا۔ ا ر علیم سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ دونوں چپ تھے۔ کمرے پر سکوت طاری تھا۔

بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بجلی بھی کڑکی۔ روشنی کی ایک تیز لکیر کھڑکی سے گزر کر کمرے میں اس طرح جھلملائی کہ دونوں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ داد محمد سومرو نے گھبرا کر کہا۔ "لگتا ہے، کہیں نزدیک ہی بجلی گری ہے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ روشنی بھی بہت تیز پھیلی تھی۔" علیم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ گفتگو کا سلسلہ از سر نو شروع ہوا تو وہ فوراً حرف مطلب زبان پر لایا۔ "یہ بتائیے اس چیک کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟"

"اسے میرے پاس چھوڑ دیجئے۔ میں ناریجو کو فون کر دوں گا۔ وہ آپ کو پندرہ ہزار روپے پہنچا دے گا۔" داد محمد نے علیم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ ٹھیک رہے گا نا؟"

علیم آمادہ نہ ہوا۔ صاف انکار کرنے کے بجائے مسکرا کر بولا۔ "میں تو کہتا ہوں، آپ اسی چیک کو پندرہ ہزار کا کر دیجئے۔"

داد محمد سومرو گومگو کے عالم میں بیٹھا بے چینی سے سر کے بال کریدتا رہا۔ علیم الدین سبزواری نے اسے مزید غور کرنے کی مہلت نہ دی۔ فوراً چھاپہ مارا۔ ایک بار پھر قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چیک نکال کر سامنے رکھا۔ نرم لہجہ میں بولا۔ "اجی، اب سوچنا کیا ہے۔" داد محمد سومرو نے بد دلی سے چیک پر قلم چلایا۔ چار سو کے پندرہ ہزار بنائے، دستخط کئے اور قلم واپس کرتے ہوئے تیکھی نظروں سے علیم کو دیکھا۔

"یہ تو سیدھی، سیدھی بلیک میلنگ ہے۔"

داد محمد سومرو کے لہجہ میں شکست خوردگی اور پسپائی سے زیادہ تحقیر کا پہلو نمایاں تھا۔ علیم اسے تلخ گھونٹ کی طرح پی گیا۔ اس نے خاموشی سے چیک اٹھایا۔ تہہ کیا اور حفاظت سے اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اطمینان کی سانس لی اور مسکرا کر جوابی حملہ کیا۔ "معاف کیجئے گا۔ اگر یہ بلیک میلنگ ہے تو آپ بھی اسمبلی کی رکنیت

حاصل کرنے کے بعد اسی طرح حکومت کو بلیک میل کریں گے۔ لائسنس اور پرمٹ اپنے اور اپنے خاندان والوں کے نام جاری کرائیں گے۔ بینکوں سے بڑے بڑے قرضے حاصل کریں گے۔ زرعی اصلاحات کو ناکام بنانے کے لئے دباؤ ڈالیں گے۔ طرح طرح کی دوسری مراعات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر وزیر تر رہو گئے تو پوری قوم کو بلیک میل کریں گے۔ آپ اسی مقصد کے لئے الکشن لڑ رہے ہیں نا؟"

"میرے بارے میں آپ نے بالکل غلط اندازہ لگایا" داد محمد سومرو نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "میں ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

"ملک اور قوم کی خدمت کے لئے تو میں بھی اخبار چلا رہا ہوں" علیم نے مڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا اور ذرا گفتگو کا موضوع بدل دیا "بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ ویسے برسات کی ایسی بھیگی بھیگی رات بسر کرنے کے لئے سمر لاج بہت مناسب جگہ ہے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ نہایت پر سکون، نہ شور نہ کسی طرح کا ہنگامہ۔ بڑا پُر فضا مقام ہے۔ آپ کی خوش ذوقی، قابل داد ہے" علیم سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ داد محمد کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے چاپلوسی بھی کرتا رہا۔

مگر داد محمد نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ ہنوز روٹھا ہوا سا بیٹھا تھا میز پر اس کا گلاس خالی پڑا تھا۔ نہ وہ پی رہا تھا نہ بول رہا تھا۔ علیم نے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھائی۔ گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ڈبل پیگ بنایا اور داد محمد کے ہونٹوں سے گلاس لگا کر بولا "سر! یہ جام، آپ کی صحت اور الکشن میں کامیابی کے لئے میری طرف سے۔ دیکھئے انکار کر کے میرا دل نہ توڑ دیجئے گا۔"

داد محمد سومرو نے علیم کا دل نہ توڑا۔ خاموشی سے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ علیم کے اصرار کرنے پر اس نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ اس دفعہ بھی وہ چپ رہا۔ علیم نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ اٹھا، اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

سومرو رک، رک کر وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ گلاس خالی ہو گیا تو اس نے دوبارہ پیگ تیار کیا۔ باہر مسلسل بارش ہوتی رہی۔ ہوا شور مچاتی رہی۔ علیم چپ چاپ بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

داد محمد سومرو گلاس پر گلاس خالی کرتا رہا۔ اس کا چہرہ بجھا، بجھا نظر آ رہا تھا۔ علیم نے اس کی کدورت

کو نہ صرف شدّت سے محسوس کیا۔ بلکہ رفع کرنے کی عزم سے بات بھی چھیڑی۔ "الکشن جیتنے کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہوگا؟"

اس نے گردن اٹھا کر خمار آلود نظروں سے علیم کو دیکھا۔ بے زاری سے بولا۔ "فی الحال تو مجھے سخت نیند معلوم ہو رہی ہے۔" نشہ کی جھونک میں وہ ایک طرف جھک گیا۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ صوفے کی پشت سے ٹکایا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

علیم الدین خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ مگر نہ اس نے جسم کو جنبش دی، نہ آنکھ کھولی۔ بے خبر سوتا رہا۔ علیم اپنی جگہ سے اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا داد محمد سومرو کے قریب گیا۔ غور سے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے خراٹے بھر رہا تھا۔ علیم نے بوتل اٹھائی۔ گلاس سنبھالا اور اپنی جگہ پر واپس آگیا۔ اب اسے وہسکی سے شغل کرنے کا موقع ملا تھا۔ حالانکہ کئی بار پینے کی زبردست خواہش ہوئی مگر وہ ہر بار ٹال گیا کہ نشہ کی جھونک میں معاملہ بگڑ نہ جائے۔

اس نے گلاس میں وہسکی ڈالی لیکن جگ میں پانی نہ تھا۔ علیم نے جگ اٹھایا۔ ایک بار پھر داد محمد سومرو پر نظر ڈالی اور غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل خانہ خالی تھا۔ شیریں جا چکی تھی۔ اس نے جگ میں پانی بھرا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

بوتل میں ابھی ایک چوتھائی سے زیادہ وہسکی موجود تھی۔ وہ پیگ بنا، بنا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ بارش کا زور کسی قدر ٹوٹ گیا تھا۔ اب ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے کھڑکی کی راہ سے کمرے کے اندر آ رہے تھے۔ علیم شراب سے شغل کرتا رہا اور خوش گوار موسم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ داد محمد سومرو آنکھیں بند کئے گہری نیند سو رہا تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ بوتل بھی ختم ہو رہی تھی۔

علیم الدین سبزواری نے آخری پیگ ختم کیا۔ سگریٹ سلگائی اور کش لگانے لگا مگر وہ پوری سگریٹ پی نہ سکا۔ نیند بار، بار شب خون مارتی۔ اس کی بوجھل آنکھیں بند ہو جاتیں۔ آخر اس نے سگریٹ بجھا دی لیکن وہ سونا نہ چاہتا تھا۔ سمر لاج سے باہر بھی نہ جا سکتا تھا۔ برسات کی تاریک رات میں سفر بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے

رات کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔
نیند کا ایک بار ایسا زبردست جھونکا آیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو کر کھل نہ سکیں۔ وہ جھوم کر ایک طرف لڑھک گیا۔ اب وہ بھی بے خبر ہو کر سو رہا تھا۔
علیم الدین کی آنکھ کھلی تو رات ختم ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر صبح کاذب کی ہلکی ہلکی کافوری روشنی اندھیرے سے پھوٹ رہی تھی۔ بارش رک چکی تھی مگر ہوا ہنوز بپھری ہوئی تھی۔ علیم نے آنکھیں ملتے ہوئے داد محمد سومرو کی جانب دیکھا۔ وہ صوفے سے لڑھ کر فرش پر آ گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ صوفے کے بازو سے اٹکی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کس حال میں تھا اور کس طرح بے غل و غش پڑا تھا۔ کمرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔
علیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے لئے سمر لاج میں مزید ٹھیرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ وہ جس مقصد سے آیا تھا پورا ہو چکا تھا۔ پندرہ ہزار روپے کا چیک اس کی جیب میں موجود تھا۔ اسے جلد سے جلد اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا کے کیش کرنا تھا۔ اپنے اخبار کے عملہ کو کچھ نہ کچھ دے کر مطمئن کرنا تھا جسے پچھلے دو ماہ سے تنخواہ نہ ملی تھی اور جس نے اب برگشتہ ہو کر، تنگ آید بجنگ آمد کی مصداق، ہڑتال کرنے کا نوٹس دیدیا تھا۔
وہ سیدھا غسل خانے میں گیا۔ منہ دھویا۔ کنگھا موجود تھا۔ اسے اٹھا کر بال سنوارے۔ لباس کی شکنیں درست کیں۔ وہ باہر جانے کے لئے مڑا تو دہلیز کے قریب چھوٹا سا ایک جھمکا پڑا ہوا نظر آیا۔ علیم نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ معاً اسے شیریں یاد آ گئی، جس کے برہنہ جسم کے پیچ و خم کو داد محمد سومرو دوربین آنکھوں پر چڑھا کر کیف و مستی کے عالم میں دیکھ رہا تھا مسکرا رہا تھا۔ وہسکی کے نشے سے جھوم رہا تھا۔
غسل خانے سے نکل کر وہ اس کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا۔ جس میں اس نے شیریں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ جھمکا اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ وہ اسے واپس شیریں کو دینا چاہتا تھا۔ قریب پہنچ کر علیم الدین سبزواری نے آہستہ سے دروازہ کھولا مگر دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ شیریں کی پیٹھ دروازے کی جانب تھی۔ اب وہ پورا لباس پہنے ہوئے تھی۔ علیم کی آمد کی اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ وہ گردن جھکائے

نہایت انہماک سے سو، سو روپے کے نوٹ گن رہی تھی۔

علیم حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا پھر وہ آہستہ سے کھنکارا۔ شیریں نے پلٹ کر علیم کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوف اور پریشانی عیاں تھی۔ گھبرا کر بولی "ا ے، تم۔ تم یہاں کیسے آگئے؟"

علیم نے جھمکا آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ جھمکا دینے آیا تھا جو تمہارے کان سے نکل کر گر گیا تھا"
وہ زیر لب مسکرایا "تمہارا ہی ہے نا؟"

شیریں کا ہاتھ فوراً اپنے کان پر گیا۔ جو خالی تھا "ہاں، میرا ہی ہے" اس نے جھمکا لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "یہ تم کو کہاں ملا؟"

"غسل خانے میں" علیم بدستور مسکراتا رہا "میں نے ہی تم کو غسل خانے میں جانے کے لئے کہا تھا۔ یاد ہے نا؟"

شیریں نے کچھ نہ کہا۔ جھمکا اپنے ہاتھ میں لیا، اور جلدی جلدی نوٹوں کو اپنی ٹانگوں کے نیچے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ علیم نے دروازہ بند کیا۔ آگے بڑھا شیریں کے قریب پہنچا۔ اس نے مشتبہ نظروں سے شیریں کو دیکھا۔ کریدکر پوچھا "یہ روپے تم نے سومرو صاحب کے سوٹ کیس سے نکالے ہیں نا؟"

"نہیں، نہیں۔ میں نے کسی کے نوٹ ووٹ نہیں نکالے۔" اس نے جلدی جلدی انکار میں گردن ہلائی اور ٹانگیں پھیلا کر نوٹوں کو پوری طرح چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں تو یہ سمجھا تھا کہ بھورے خاں نے سوٹ کیس پر ہاتھ صاف کر دیا مگر اب معلوم ہوا تم تو اس سے بھی اونچی کلاکار ہو - ایسی ہاتھ کی صفائی دکھائی کہ کانوں کان خبر نہ ہوئی" علیم کھل کر مسکرایا "بھئی تمہاری کاریگری کے تو ہم بھی قائل ہو گئے۔ بھورے خاں تو شاہجہان پور کا ہے معلوم ہوتا ہے۔ تم بنارس کی رہنے والی ہو"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا" وہ تنک کر بولی۔

علیم، اس کی برہمی سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ آنکھ مار کر شوخی سے بولا "کتنے ہیں؟"

"کتنے بھی ہیں، تم سے مطلب؟"

"مجھ سے تو کوئی مطلب نہیں، مگر وہ وڈیرا جو باہر موجود ہے، اس سے تو ہے۔" اس دفعہ علیم نے اسے دھمکی دی۔

شیریں اس کی دھمکی سے پریشان ہوگئی۔ اس کا سارا طنطنہ ہوا ہوگیا۔ نظریں جھکا کر دبی زبان سے پوچھا "وہ ابھی تک سو رہا ہے یا جاگ گیا؟"

"فی الحال تو سو رہا ہے۔" علیم نے اسے مزید خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ "مگر اسے جگانے میں کتنی دیر لگے گی۔"

"نہیں، نہیں ایسا نہ کرنا۔" وہ بدحواس ہو کر بولی۔ "اسے جگانے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔"

اس نے پسپائی اختیار کی تو علیم بھی نرم پڑ گیا "مگر، تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

"تم نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس نے مجھے کس کس طرح ستایا۔ کیسی کیسی واہیات حرکتیں کیں۔" وہ پریشان ہو کر گڑگڑانے لگی۔ "اللہ کے لئے اس سے کچھ نہ بتانا۔ وہ ساری رقم چھین لے گا اور میرے پانچ سو روپے بھی نہیں دے گا۔ گالیاں دے گا۔ مارپیٹ کرے گا۔ تم کو کیا خبر۔ وہ کتنا سنگدل اور حرام زادہ ہے۔" شیریں نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ "اس نے جو کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ تم چاہتے ہو۔ میں اس سے اتنی قیمت بھی وصول نہ کروں۔"

شیریں کے رویّہ میں عاجزی کے ساتھ ساتھ رقّت بھی تھی۔ اس کی باتیں سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے دل میں شیریں کے لئے ہمدردی کے جذبات محسوس کئے۔ وہ گومگو کے عالم میں خاموش کھڑا رہا۔ شیریں نے پانچ سو روپے کے نوٹ نکالے اور علیم کی طرف بڑھا کر بولی۔ "لو یہ روپے رکھ لو۔"

اس نے روپے علیم کے ہاتھ میں دے دیئے۔

علیم روپے ہاتھ میں لئے ہکّا بکّا کھڑا رہا۔

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو اسے مجھ پر ذرا بھی شبہ نہ ہوگا۔" شیریں نے نرم لہجے میں اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ "اسے اسی طرح سونے دو۔ اب تم جاؤ۔ میں نے تم کو تمہارا حصّہ دے دیا۔ دس فی صدی

سے اتنا ہی بنتا ہے ۔"

علیم ایک دم بھڑک اٹھا۔ تیکھے لہجہ میں بولا" میں ایک عزت دار اخبار نویس ہوں تم نے مجھے کوئی دلال یا بھڑوا سمجھا ہے ۔میں رنڈیوں کی کمائی اور چوری کے مال میں حصہ نہیں بٹاتا۔" اس نے جھنجلا کر سارے روپے شیریں کے منہ پر پھینک دیئے۔

"ارے، ارے، تم اتنے خفا کیوں ہو گئے؟" وہ حیران و پریشان ہو کر بولی" اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟"

علیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہوا مڑا۔ آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور کمرے سے نکل گیا۔ داد محمد سومرد ابھی تک اسی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ علیم نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا زینے پر پہنچا۔ سیڑھیاں طے کیں نیچے اترا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ مگسی بھی کہیں نظر نہ آیا۔ سمر لاج کے دوسرے نوکروں کی طرح وہ بھی ابھی تک سو رہا تھا۔

علیم نے صدر دروازہ کھولا اور سمر لاج سے باہر چلا گیا۔

کیمیاگر

ہلکی سی آہٹ ہوئی دیوار پر پرچھائیں لہرائی۔ میری آنکھ کھل گئی۔

یہ احمد تھا جو چوروں کی طرح دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا اور میرے سرہانے کھڑا سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونوں جوتے لٹک رہے تھے۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں جنگلی بلی کی مانند چمک رہی تھیں۔

جب پہر رات گزر جاتی اور سنسان گلیوں میں آوارہ کتے بھونکنے لگتے تو دروازے کے باہر احمد کے قدموں کی آہٹ ابھرتی۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس طرح دروازے کی چٹخنی کھول کر گھر کے اندر داخل ہوتا تھا۔ میں صرف اس قدر جانتا ہوں کہ وہ آدھی رات سے پہلے کبھی نہیں لوٹا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔

مگر اس روز خلاف معمول جلد ہی واپس آ گیا تھا۔ ذرا دیر دم سادھے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے فرش پر جوتے رکھے۔ کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا، اور اندھیرے میں اسٹول تلاش کرنے لگا لیکن اسٹول نہ مل سکا۔ لہٰذا اس نے ایک ہاتھ دروازے پر رکھا اور دیوار پہ پیر ٹکا کر مچان پر چڑھنے لگا۔ میں خاموش لیٹا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ سامنے دیوار کے سہارے لٹکا ہوا، وہ پر کٹے کبوتر کی طرح اچھل، اچھل کر مچان کے اوپر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں زیادہ دیر اسے اس پریشانی کے عالم میں نہ دیکھ سکا۔ آخر مجھے بولنا ہی پڑا: "احمد روشنی کرلو۔"

وہ اندھیرے میں دم بخود کھڑا رہا۔

جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

اور اس تیز روشنی میں وہ مچان کو دونوں ہاتھوں سے تھامے چمگادڑ کی مانند لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا کھسیانا ہو کر بولا "بھائی جان آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟"

"اسٹول لے لو، مچان بہت اونچی ہے۔" میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

وہ بلندی سے اتر کر نیچے آگیا اور اسٹول لینے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر اس نے جھجکتے ہوئے کہا "میں نے ایک جگہ مکان دیکھا ہے بغیر پگڑی کے مل جائے گا۔"

مجھے پتہ تھا کہ وہ کہیں مکان دکان دیکھنے نہیں گیا تھا بلکہ اب تک ماسٹر رحمت علی کے کمرے میں بیٹھا "انعامی معمہ" حل کر رہا ہو گا۔ میں اس کی بات سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ کسی قدر بے زاری سے بولا "اچھا صبح اس سلسلے میں بات کرنا۔ اب رات خاصی ہو چکی ہے جا کر سو جاؤ۔"

وہ اصرار کرنے لگا "سچ کہہ رہا ہوں بھائی جان، یہ مکان تو مل ہی جائے گا۔"

"جاؤ آرام کرو۔ خواہ مخواہ نیند حرام نہ کرو۔" میں نے بڑی بے رخی سے جواب دیا۔

مگر وہ باز نہ آیا کہنے لگا "آپ میری بات تو سن لیجئے۔" اس دفعہ اس کے لہجے میں ٹٹ پونجیے دکانداروں کی سی خوشامد تھی: "نہ پگڑی کا جھنجھٹ، نہ سال، دو سال کا کرایہ دینے کی شرط صرف مہینہ بھر کا کرایہ پیشگی دینا ہو گا۔ آپ میرے کہنے سے ایک بار چل کر مکان تو دیکھ لیجئے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

مجھے لامحالہ دلچسپی کا اظہار کرنا پڑا۔ ہم دونوں دیر تک مکان کے بارے میں بات کرتے رہے پھر وہ مچان پر جا کر لیٹ گیا۔ میں نے بجلی بجھائی اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسرے روز یہ بات گھر بھر میں سب کو معلوم ہو چکی تھی۔

شام کو دفتر سے واپسی کے بعد ہم دونوں بھائی مکان کا معاملہ طے کرنے چل دیے۔ وہاں پہنچ کر

دیکھا، علاقہ خاصا ویران اور اجاڑ تھا۔ شہر سے دور بھی تھا۔ سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ ہُو کا عالم تھا۔ درمیان سے پختہ سڑک گزرتی تھی۔ دونوں جانب دور تک پھیلا ہوا بنجر اور ناہموار میدان تھا۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے پرانی وضع کے بنگلے تھے۔ ان ہی میں وہ بنگلہ بھی تھا۔ کھپریل کی آگے کو جھکی ہوئی چھت تھی۔ دیواریں پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ چاردیواری قدِ آدم تھی مگر بوسیدہ اور شکستہ تھی۔

جس شخص سے معاملہ طے کرنا تھا۔ وہ پھاٹک پر ہی مل گیا۔ ادھیڑ آدمی تھا۔ بظاہر چڑچڑا لگتا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ ہم دونوں کو بنگلے کے اندر لے گیا۔ کل پانچ کمرے تھے۔ ایک کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ بقیہ چار کمرے اس نے دکھائے۔ بہت پسند آئے۔ کمرے کشادہ اور صاف ستھرے تھے۔ ان کے علاوہ طویل برآمدہ تھا۔ راہداریاں تھیں۔ عقبی حصے میں باورچی خانہ تھا۔ جس کی چھت میں دھواں باہر نکلنے کے لیے چمنی تھی۔ ہوا کی آمد و رفت کے لیے دو کھڑکیاں بھی تھیں۔ بنگلے کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ جگہ جگہ گھنے اور سایہ دار درخت تھے۔

ہم دونوں بھائی، گھوم پھر کر، اچھی طرح بنگلے کو دیکھ چکے تو اس شخص نے خود ہی معاملے کی بات چھیڑی۔ کہنے لگا: "بنگلہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا مگر آپ کو صرف دو کمرے رہنے کے لیے مل سکتے ہیں۔"

"کرایہ کیا ہوگا؟" میں نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"سو روپے مہینہ سے ایک پیسہ کم نہ ہوگا۔" اس نے بڑے کھرے لہجے میں کہا۔ "نہ پگڑی کا چکر، نہ لمبا چوڑا ایڈوانس۔ جی چاہے تو کل ہی سامان لے کر آ جائیے۔"

اس وضاحت کے بعد بھی میری تسلی نہ ہوئی۔ کرید کر پوچھا "کوئی اور شرط ہو تو وہ بھی بتا دیجیے۔ بعد میں بکھیڑا پیدا نہ ہو۔"

"بس ایک مہینے کا کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی شرط ورط نہیں۔"

ہر چند کہ علاقہ اجاڑ اور ویران تھا لیکن ایسے شاندار بنگلے میں صرف سو روپے ماہوار کرایہ پر بغیر پگڑی کے رہائش مل جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ شاید اللہ میاں کو ہماری پریشان حالی پر رحم آ گیا تھا۔

میں نے دبی زبان میں پوچھا "اس بنگلے میں آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔۔۔؟"

وہ بولا "جی نہیں، میں اکیلا ہی رہتا ہوں. تنہائی میں بڑا دل گھبراتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا "آپ لوگ یہاں آجائیں گے تو ذرا چہل پہل ہو جائے گی۔"

مجھے اس کی باتوں پر یقین نہ آیا. ایک بار پھر اس کی وضع قطع کا جائزہ لیا. موٹا سوتی کرتا. بے ترتیب گھنی داڑھی، سر منڈا ہوا. پیروں میں بوسیدہ جوتا. بھلا اس حلیے کا شخص اس بنگلے کا کس طرح اہل ہو سکتا تھا. ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ تھی. صاف بات پوچھنے کی گنجائش نہ تھی۔

میں نے گھما پھرا کر دریافت کیا "یہ بنگلہ آپ نے خریدا ہے یا الاٹ ہوا ہے؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا "نہیں صاحب، میں تو ملازم ہوں. بنگلہ تو ہمارے سیٹھ صاحب کا ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جس کا بنگلہ تھا، وہ اس میں رہتا کیوں نہ تھا. لہٰذا پوچھنا پڑا "کیا وہ کہیں باہر گئے ہیں؟"

"ان کی نہ پوچھیے۔" وہ بے تکلفی سے بولا "کبھی کبھار ایک آدھ روز کے لیے یہاں آکر ٹھیرتے ہیں. ورنہ ان کی اپنی کوٹھی تو باتھ آئی لینڈ میں ہے۔"

"ہمارے یہاں رہنے پر انہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

وہ جلدی سے بولا "توبہ کریں جی، ان باتوں میں کیا رکھا ہے. اول تو انھیں پتہ ہی نہ چلے گا اور جو کبھی پوچھ بیٹھے تو کہہ دوں گا میرے رشتے دار ہیں. یہ ٹھیک رہے گا نا؟" وہ بندر کی طرح بتیسی نکال کر ہنسنے لگا۔

صورت حال اب بالکل واضح ہو گئی تھی. دراصل وہ بنگلے کے دو کمرے کرایہ پر اٹھا کر اپنی آمدنی میں سو روپے کا اضافہ کرنا چاہتا تھا. مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا. اعتراض تو اس کے ساتھ رشتہ داری جوڑنے پر بھی نہ تھا. یہاں تو آم کھانے سے غرض تھی. پیڑ گننے نہیں آئے تھے۔

غرضیکہ تمام ضروری معاملات اسی وقت طے ہو گئے. اب صرف ایک ماہ کا پیشگی کرایہ دے کر سامان لانا رہ گیا تھا۔

باتیں کرتے کرتے، رات کا ایک پہر گزر گیا. ہر طرف اندھیرا پھیل گیا سناٹا گہرا ہو گیا تھا اور اس

گہرے سناٹے میں، پتھر کی دیواروں والا، قدیم وضع کا بنگلہ، بڑا ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ سرما کی تیز ہوا کی سرسراہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ باہر درختوں کے خشک پتّے رک رک کر کھڑکھڑا رہے تھے۔ ناگاہ بنگلے کے پھاٹک پر ایک کار آکر رکی۔ رات کے سناٹے میں زور، زور سے ہارن بجنے لگا۔

وہ شخص گھبرا کر بولا۔ "سیٹھ صاحب آگئے" اور فوراً کمرے سے باہر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد احاطے میں درختوں کے نیچے خشک پتوں پر چاپ سنائی دی اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

پھر اس کمرے کا تالا کھلنے کی آواز ابھری، جو بند تھا۔

چند منٹ بعد وہ شخص واپس آیا مگر گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی بولا "میں ذرا دیر کے لیے ایک کام سے جا رہا ہوں، آپ دونوں" اس نے جملہ پورا ابھی نہ کیا تھا کہ کسی نے بھاری بھرکم آواز میں پکارا۔

"شبدار"، اس نے ہماری جانب پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے۔ سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا، تاریکی بڑھ گئی تھی۔ ہوا کے جھونکے تیز ہو جاتے تو خشک پتے کھڑکھڑاتے۔ پُراسرار آہٹیں ابھرتیں۔ ماحول آسیب زدہ ہو گیا تھا۔ نکڑ والے کمرے سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز رک رک کر ابھرتی، کبھی کبھی قہقہہ بھی بلند ہوتا۔

جب دیر تک شبدار واپس نہ آیا تو میں نے اکتا کر سوچا۔ ذرا دیکھوں تو اس کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ شاید شبدار بھی وہاں موجود ہو۔ نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ سردی بڑھ گئی تھی اور ابھی ہم دونوں کو کئی میل جانا تھا، سنسان راستہ، رات کا وقت، اب زیادہ دیر وہاں ٹھیرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ اسی ادھیڑبن میں ڈوبا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے کی جانب بڑھا۔

وہ کمرہ مشرقی رخ پر تھا۔ درمیان میں دو کمرے اور پڑتے تھے۔ میں نے پہلا کمرہ عبور کیا۔ دوسرے میں پہنچا، بیچ کے بند دروازے سے جو دونوں کمروں میں آمد و رفت کے لیے تھا، روشنی کی ایک باریک شعاع پھوٹ رہی تھی۔ میں ہولے ہولے چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا، جھری سے ایک آنکھ لگا کر اس کمرے میں نظر دوڑائی۔ کمرہ وکٹورین طرز کے نفیس اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ کھڑکیوں پر شوخ رنگ کے ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک گوشے میں چوڑا چکلا چھپر کھٹ تھا۔

چھپر کھٹ کا سرہانہ اونچا اور محراب نما تھا۔ اس پر خوبصورت نقش و نگار تھے۔ قریب ہی صوفہ سیٹ تھا۔ اس پر پستہ قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا۔ وہ قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ناک نقشہ بھدا تھا، مگر آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں، داڑھی، مونچھ بالکل صاف تھی۔ سر گنجا اور بجلی کی ہلکی ہلکی سرخ روشنی میں تام چینی کے پیالے کی طرح چمک رہا تھا۔

سامنے میز پر وہسکی کی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔ وہ شخص گردن جھکائے ایک گلاس میں وہسکی ڈالنے میں مشغول تھا۔ اس کے عین مقابل صوفے کی پشت سے سر ٹکائے ایک نوجوان عورت خوب بنی سنوری بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھی۔ رنگ چمپئی تھا۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا۔ بال سیاہ اور چمک دار تھے۔ گردن لمبی تھی۔ سرخ روشنی میں اس کا چہرہ شعلے کی مانند دہک رہا تھا۔

عورت نے اپنی لمبی گردن کو خم دے کر اس قدر آہستہ سے کچھ کہا کہ میں سن نہ سکا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایسے اشتعال انگیز ڈھب سے بیٹھی تھی کہ ساڑھی سرک کر بے ترتیب ہو گئی تھی اور ایک ٹانگ دور تک برہنہ ہو گئی تھی۔ گنجے سر والے مرد نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، مسکرایا اور خالص رنڈی بازوں کے انداز میں آنکھ مار کر ایسا بیہودہ اور بازاری جملہ کہا کہ مجھے اپنے بدن میں جھُرجھُری سی محسوس ہوئی۔

اسی وقت کسی نے میری گردن کے پاس گہری سانس بھری۔ میں گھبرا کر مڑا۔ دیکھا احمد میری پشت پر کھڑا تھا۔ نہ جانے وہ کب وہاں پہنچا تھا۔ ہماری نظریں ملیں تو فوراً گردنیں جھک گئیں۔ دونوں ہی سخت شرمندہ ہوئے۔

چند لمحے پشیمانی کے عالم میں ہم دونوں گم صُم کھڑے رہے۔ بات کرنے کی گنجائش نہ تھی اور وہاں ٹھیرنا بھی مناسب نہ تھا لہٰذا میں نے قدم اٹھایا اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے کی جانب چلا۔ احمد سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ میں رکا نہیں۔ کمروں سے گزر کر برآمدے میں آ گیا۔

جب میں بنگلے سے باہر نکلنے لگا تو احمد نے ٹوکا۔ دبی زبان سے بولا "بھائی جان شبدار کے واپس آنے تک تو ٹھیر جایئے۔"

میں نے جل کر کہا "تم کو اگر اس سے بات کرنا ہے تو ٹھیر جاؤ۔ میں یہاں ایک لمحہ رکنا نہیں چاہتا۔

سخت واہیات جگہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ"۔

احمد نے مزید کچھ نہ کہا ہم دونوں باہر آگئے۔ درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے احاطہ طے کیا۔ پھاٹک پر پہنچے۔ دیکھا، گہرے نیلے رنگ کی ایک لمبی چوڑی کار پھاٹک کے نزدیک ہی کھڑی تھی۔ کوئی اندر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ شاید ڈرائیور تھا۔ ہم کار کے قریب سے گزرے تو اس نے گردن باہر نکالی۔ جھانک کر دیکھا مگر کوئی بات نہ کی۔

تمام راستے ہم دونوں خاموش رہے۔ نہ احمد نے کوئی بات چھیڑی اور نہ ہی مارے ندامت کے مجھے بولنے کی ہمت ہوئی۔ گھر واپس پہنچ کر دیکھا، سب سو چکے تھے۔ بچّوں نے میدان صاف پایا تو میرے بستر پر قبضہ کر لیا۔ بڑی مشکل سے ایک ایک کو گہری نیند سے بیدار کیا۔ دو تو مرغی کے چوزوں کی طرح حسب معمول پلنگ کے نیچے گھس گئے۔ بقیہ ایک قطار میں سامنے فرش پر لیٹ گئے۔ بیوی کا بستر کپڑوں کے ٹرنکوں پر لگا تھا۔ احمد مچان پر چلا گیا اور میں تھکا ہارا اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ جاڑوں میں ہماری راتیں اسی طور پر بسر ہوتی تھیں۔ مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ بستر پر پڑا سوچتا رہا کہ خواہ مخواہ احمد کے بھرّے میں آگیا۔ اس طرح کہیں مکان ملتا ہے۔ پتہ نہیں میری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جس مکان میں رہتا ہوں۔ چند برس پہلے اسے ہزار روپے دے کر پگڑی پر لیا تھا۔ اب اس کے پندرہ سو مل رہے تھے۔ یعنی مکانوں کی قلت کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی تھی۔

(۲)

اس مکان کا حال بھی سُن لیجیے، جس میں ان دنوں میری رہائش تھی۔ کسی زمانے میں یہ ایک وکٹوریہ والے کے پاس تھا۔ وہ اسے اپنی وکٹوریہ کے گھوڑے کے لیے بطورِ اصطبل استعمال کرتا تھا۔ اس میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی کوئی نہ تھی۔ البتہ پچھلی دیوار میں ایک روشن دان ضرور تھا۔ اس سے ہوا اور روشنی تو کیا آتی، صرف یہ اندازہ ہو جاتا کہ دن ہے یا رات۔ ورنہ کمرے کے اندر دن رات برابر تھے۔ چوبیس گھنٹے بجلی کا ایک بلب روشن رہتا تھا۔ شروع شروع میں اس اصطبل سے نکل بھاگنے کی میں نے بہت کوشش کی مگر جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور قسمت نے بھی یاوری نہ کی تو تنگ

ہار کر بیٹھ گیا. قناعت کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

پچھلے سال احمد بھی آگیا اور میرے ساتھ ہی رہنے لگا۔ ان دنوں وہ دفتر سے واپسی پر سیدھا گھر آتا اور کھانا کھا کر سرِ شام ہی پڑ کر سو جاتا مگر میرے ایسے آدمی کے لیے جو شادی شدہ بھی ہو اور جس کے پاس رہنے کے لیے ایک ہی کمرہ ہو احمد کچھ ہی عرصہ بعد ایک مسئلہ بن گیا۔ سوچتے سوچتے آخر کار میں نے اس مسئلے سے نمٹنے کی ایک صورت نکال ہی لی۔ ایک روز دفتر سے لوٹا تو ایڈوانس بکنگ کرا کے سینما کے سیکنڈ شو کا ایک ٹکٹ لیتا آیا۔ احمد کو ٹکٹ دے کر یہ بہانا تراشا کر ایک ملنے والے دے گئے تھے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں، تم جا کر فلم دیکھ آؤ۔ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ احمد خوشی خوشی سینما چلا گیا۔ بعد میں اکثر میں سینما کے ٹکٹ لاتا رہا اور وہ ٹھاٹھ سے فلم دیکھتا رہا۔

لیکن جس شخص کی تنخواہ مبلغ دو سو چالیس روپے ماہانہ ہو اور جس کے دامن سے ایک نیک بخت اور چار عدد چنا پوٹی بیٹے ہوں، زیادہ عرصہ ایسی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے جو کم خرچ اور بالانشین ہو۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک روز احمد خود ہی مسئلے کی اصل نوعیت سمجھ گیا۔ اسی روز سے اس نے مکان تلاش کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ کئی بار ناکامی کا منہ دیکھنے کے باوجود وہ ابھی تک ناامید نہ ہوا تھا۔

وہ معمول کے مطابق رات گئے واپس آتا۔ چوروں کی طرح آہستہ سے دروازے کی چٹخنی کھولتا۔ اندر داخل ہوتا اور چپ چاپ مچان پر جا کر سو جاتا۔ انھی دنوں چھوٹے بچّے کو کالی کھانسی ہو گئی۔ وہ اکثر سوتے سوتے جاگ اٹھتا اور کھانستے کھانستے رونا شروع کر دیتا۔ اس کے رونے سے دوسرے بچے بھی اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ پھر سب مل کر ایک ساتھ روتے۔ رات کے سناٹے میں ان کی ملی جلی آوازیں اس غار نما کمرے میں گیدڑوں کے شور کی مانند بھیانک معلوم ہوتیں۔

ایک رات جب سب بچّے اونچی نیچی آوازوں کے ساتھ کورس کے انداز میں رو رہے تھے کہ احمد بھی آگیا۔ خلافِ توقع وہ اس وقت بہت ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ اس نے لاپرواہی سے کوٹ اتار کر ایک طرف ڈالا میرے قریب آیا مسکرا کر گویا ہوا۔

"بھائی جان، آج آپ کو ایک زبردست خوشخبری سناؤں؟"

میں بچوں کی چیخ و پکار سے پہلے ہی بھنّایا ہوا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اور زندہ دلی بہت شاق گزری۔

جھنجھلا کر بیزاری سے بولا "خواہ مخواہ پریشان مت کرو جاؤ، جا کر سو جاؤ۔"

اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ گھگھیا کر بولا "آپ میری بات تو سن لیجیے۔"

"مکان کی بات کے علاوہ کچھ اور کہنا چاہتے ہو تو کہہ سکتے ہو۔"

"بات تو مجھے مکان ہی کے بارے میں کرنی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میں جل کر بولا "تب تو تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

مگر وہ باز نہ آیا کہنے لگا "بس ایک بار میری بات اور مان لیجیے۔ اس دفعہ مکان نہ ملے تو آپ کبھی میری بات پر اعتبار نہ کیجیے گا۔"

ایک بار پھر میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ کچھ دیر اس نے مکان کے بارے میں باتیں کیں اور مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ مچان پر چلا گیا۔ میں خاموش لیٹا روشندان کو تکتا رہا۔ جس سے چاندنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور کمرے کی نڈھال تاریکی میں زندگی کی ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ میں چاندنی کو دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ اتوار کی ایک سرد اور غبار آلود شام تھی۔ کوئٹہ کی تیز برفانی ہوا چل رہی تھی۔ آفتاب غروب ہوتے ہی بازاروں کی رونق اجڑنے لگی تھی۔ سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ ہم دونوں بھائی جب اس دو منزلہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے تو بجلی کے کھمبوں پر بلب روشن ہو چکے تھے۔ دریچوں کے شیشوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

اس دفعہ ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جو کسی سرکاری محکمے میں بڑا افسر رہ چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ہی لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ پنڈی میں رہتی تھی۔ سال سوا سال بعد میکے آتی تھی مگر پچھلے دو سال سے وہ بھی نہیں آئی تھی۔ آٹھ کمروں کی اس عالی شان کوٹھی میں صرف وہ تھا اور اس کی بیوی۔ اپنے بارے میں یہ تفصیلات اس نے

ہی بیان کی تھیں۔

وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ احمد سے اس کی ملاقات پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مجھ سے مل کر اس نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ ذرا دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اس نے خود ہی مکان کا ذکر چھیڑا۔ کہنے لگا۔ ”سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد، میں نے ایکسپورٹ امپورٹ کا کام شروع کر دیا ہے۔ ٹیکسٹائل مل لگانے کا لائسنس بھی مل چکا ہے۔ فارن ایکس چینج کے لیے قرضہ بھی منظور ہو گیا ہے۔ تمام دن کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا ہوں۔ صبح نکلتا ہوں۔ اکثر رات گئے واپس آتا ہوں۔ میری بیگم اتنی بڑی کوٹھی میں تمام دن اکیلی رہتی ہیں۔ ان کا دل تنہائی سے بہت گھبراتا ہے۔ چاہتا ہوں کوئی یہاں آ کر ٹھہر جائے تو ان کا دل بہل جائے گا۔“ وہ عمر کے اعتبار سے ادھیڑ تھا۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ جسم بھاری بھرکم تھا مگر چہرے پر خوشحالی کی رونق تھی۔ لہجہ نرم اور شگفتہ تھا۔

اس کی پرکشش شخصیت سے میں خاصا متاثر ہوا۔ ساتھ رہنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو وہ خوش ہو کر بولا۔ ”تو پھر سوچنا کیا ہے جب جی چاہے سامان لے کر آ جائیے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی ہے۔ آپ اطمینان سے یہاں آ کر رہیں۔“ اس نے ہاتھ سے احمد کی جانب اشارہ کیا۔ ”آپ کے یہ چھوٹے بھائی میرے پاس آئے تھے۔ مکان کے سلسلے میں اپنی پریشانی بتاتے تھے۔ ان کی باتیں سن کر دل تڑپ اٹھا۔ سوچا کیسا ستم ہے۔ میں اتنی بڑی کوٹھی میں رہتا ہوں۔ جس کے بیشتر کمروں کا میرے لیے کوئی مصرف نہیں اور ایک آپ ہیں کہ رات بسر کرنا بھی مسئلہ ہے۔ ایسی جگہ رہتے ہیں، جہاں نہ روشنی ہے نہ ہوا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اتنا وقت آپ نے کس طرح بسر کیا۔“

”نہ پوچھئے کس مشکل میں وقت گزرتا ہے۔“ میں نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”کیا، کیا جائے۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔“

وہ اس قدر مہربان ہوا کہ کرایہ لینے پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ میں نے اصرار کیا لیکن وہ کسی طور رضامند نہ ہوا۔ بار بار اظہار ہمدردی کرتا تھا۔ تسلی دیتا تھا۔ دل جوئی کرتا تھا۔ آدمی نہیں فرشتہ تھا۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ ایک بار تو جی چاہا کہ جھک کر اس کے پیر پکڑ لوں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔

اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے غالباً دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا مسکرا کر گویا ہوا۔

"اب آپ اپنی پریشانی بھول جایے۔ یہ بتایے کب سامان لانے کا ارادہ ہے میرا خیال ہے اوپر کی منزل کے تین کمرے آپ کے کنبے کے لیے کافی ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ بالکل کافی ہوں گے۔" اس دفعہ احمد بولا۔ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔ خوشی اور وارفتگی سے اس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ مگر میں اپنے امڈتے ہوتے جذبات کا برملا اظہار نہ کر سکا۔ احمد نے کر دیا۔ "آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ میرے پاس اس کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے۔"

"میاں صاحبزادے یہ تکلفات چھوڑو۔ کام کی بات کرو۔" وہ احمد کی بات کاٹ کر سرپرستانہ انداز میں بولا۔ "میں تو اوپر کی پوری ہی منزل دے دیتا مگر ایک کمرے کو میں اسٹڈی روم کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ خاص طور پر گرمی کے موسم میں رات کا بڑا حصہ اسی میں گزارتا ہوں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ بہت ہوادار ہے۔ ولیسٹ اوپن ہے۔" وہ مسکرایا۔ "یوں سمجھیے۔ گھر پر وہ میرا دفتر ہے۔"

میں نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔ "ہماری وجہ سے آپ ڈسٹرب تو نہیں ہوں گے؟"

"بالکل نہیں ہوں گا۔" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "سوال یہ ہے کہ کہیں آپ کی پرائیویسی ڈسٹرب نہ ہو۔ ویسے میں عام طور پر اسے گرمی کے دنوں میں ہی استعمال کرتا ہوں۔ ابھی تو موسم سرما ہے۔"

"آپ آج کل بھی اسے استعمال کریں اور شوق سے استعمال کریں۔ ہم کو مطلق تکلیف نہ ہو گی۔" احمد نے نہایت مستعدی سے اسے یقین دلایا۔

وہ بدستور ہنستا رہا۔ میں بھی مسکرانے لگا۔ احمد کے ہونٹوں پر بھی خوشی تبسم بن کر بار بار ہویدا ہو رہی تھی۔ غرضیکہ سارے مراحل نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ وہ جلد ہی اس قدر گھل مل گیا، گویا ہم ایک دوسرے کو سالہا سال سے جانتے ہیں۔

ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو بیوی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ دبلی پتلی سرو قد عورت تھی۔ کھلتا ہوا رنگ، پروقار چہرہ۔ سر کے بالوں میں جگہ جگہ سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں، مگر ویران اور بجھی بجھی۔ انھیں دیکھ کر میں نے یہی محسوس کیا تھا۔ وہ چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

اور تمام وقت خاموش بیٹھی رہی ۔ کبھی کبھار کسی بات پر زیرِ لب مسکراتی ۔ نہایت بردبار اور کم سخن عورت تھی ۔
نو بجے کا عمل ہو گا کہ ہم نے واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن وہ مصر ہو گیا کہ کھانا کھا کر جانا ہو گا ۔ مجبوراً رات کا کھانا بھی وہیں کھایا ۔ کافی کی ایک ایک پیالی بھی پی ۔ اس نے گرمجوشی سے ہم دونوں کو رخصت کیا اور جلد سے جلد سامان لانے پر اصرار کیا ۔
ہم دونوں کوٹھی سے باہر نکلے تو سناٹا گہرا ہو چکا تھا ۔ سردی بڑھ گئی تھی ۔ مگر احمد اپنی کامیابی پر خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس خود غرض اور نفسا نفسی کے زمانے میں ابھی کچھ ایسے نیک اور دردمند لوگ موجود ہیں جو کسی کو دکھ درد میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں ۔ ایسے بھلے اور خدا ترس انسان نہ ہوتے تو کب کی قیامت آ چکی ہوتی ۔
سردی سے ہم دونوں ہی تھر تھرا رہے تھے اور سکڑے سکڑائے تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے مگر کوٹھی سے تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی ۔ ٹھٹک کر ہم جہاں تھے وہیں رہ گئے ۔ پلٹ کر دیکھا ۔ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر ہماری طرف آ رہا تھا ۔ وہ بوڑھا اور کمزور تھا ۔ لباس ملگجا اور ڈھیلا ڈھالا تھا ۔ وضع قطع سے کسی کوٹھی کا ملازم نظر آتا تھا ۔
قریب آیا تو میں نے حیرت سے پوچھا ۔ "کیا بات ہے بڑے میاں ؟"
اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے ہم دونوں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور عجب بے تکی بات کہی ۔
"دیکھنے میں تو آپ دونوں ہی شریف اور بھلے مانس لگتے ہیں ۔"
میں تو خاموش رہا مگر احمد سے ضبط نہ ہوا ۔ تیکھے لہجے میں بولا ۔ "تمہارے خیال میں ہم چور یا اٹھائی گیرے ہیں ۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو ؟"
"ارے ارے ، آپ تو برا مان گئے ۔" گھبرا کر اس نے معذرت کی ۔ "بخدا میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ۔"
"پھر کیا مطلب ہے ؟" میں نے اسے مشتبہ نظروں سے گھور کر دیکھا ۔
"میں تو آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس شخص کے چکر میں نہ پڑیئے گا ۔" اس نے دو منزلہ کوٹھی کی طرف مڑ کر نظر ڈالی ۔ "ایک نمبر بدمعاش ہے ۔"

میں حیران و پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بغلوں میں ہاتھ دبائے سردی سے کپکپا رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ دھندلی روشنی میں وہ سکڑا سمٹا عجیب اول جلول نظر آ رہا تھا مجھے اس کی بات پر مطلق یقین نہ آیا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ احمد بھی خاموش رہا۔

ہم دونوں کو گم صُم اور حیرت زدہ پا کر وہ گویا ہوا۔" ارے صاحب، آپ اس کے کرتوت نہیں جانتے ہیں تو پچھلے کئی سال سے اس کے پاس ملازم ہوں۔ مجھ سے زیادہ اس حرامی کو کون جانے گا۔ آپ کا تو ابھی اس سے سابقہ بھی نہیں پڑا۔"

میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔" بڑے میاں آخر معاملہ کیا ہے۔ صاف صاف بات کرو۔"

" بھئی، اپنی سمجھ میں تو آیا نہیں، تم ایسی باتیں کیوں کہہ رہے ہو؟" احمد نے بھی اپنے شک و شبہے کا اظہار کیا۔

" میں تو آپ کو خبردار کر رہا ہوں۔ آگے آپ کی مرضی۔" بوڑھے کے لہجے میں تلخی تھی۔" صاف بات سننا چاہتے ہیں، تو وہ بھی سن لیجیے۔ یہ سالا ہمدرد بن کر پریشان اور ضرورت مند لوگوں کو اپنی کوٹھی پر بلا کر ٹھیراتا ہے۔ شروع شروع میں بڑی آؤ بھگت کرتا ہے۔ ایسی محبت اور شفقت جتاتا ہے کہ میں آپ سے کیا بتاؤں۔" اس نے قدرے توقف کیا۔" بعد میں عورتوں پر طرح طرح سے ڈورے ڈالتا ہے۔ ان کی عزت خراب کرتا ہے۔"

میں تو دم بخود رہ گیا مگر احمد سے خاموش نہ رہا گیا بگڑ کر بولا۔" ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

" تو پھر ایسا کیجیے، چند روز رہ کر دیکھ لیجیے خود ہی حقیقت کا پتہ چل جائے گا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

میں نے کرید کر پوچھا۔" مگر اس کی تو بیوی بھی موجود ہے۔ اسے ان باتوں کی خبر نہیں۔"

" کیوں نہیں خبر ہے۔ سب خبر ہے۔" بوڑھے نے بتایا۔" لیکن وہ بے چاری کیا کر سکتی ہے۔ کچھ کہتی ہے تو اسے ہنٹر سے سڑاک سڑاک مارتا ہے۔ بڑا ترس آتا ہے اس پر۔ بہت صابر و شاکر

عورت ہے۔"

"بیٹی کے پاس پنڈی کیوں نہیں چلی جاتی؟"

"میں نے بھی سمجھایا۔ بیٹی نے بھی زور دیا مگر وہ ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ اب تو اس کے گھر سے جنازہ ہی نکلے گا۔ جیتے جی تو یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔" بوڑھے نے میرے دریافت کرنے پر کہا: "بیٹی سے ماں کی حالت دیکھی نہ گئی۔ باپ سے لڑ جھگڑ کر ایسی گئی کہ اب تک اس گھر میں قدم نہیں رکھا لیکن اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ روزانہ رات کو دبا کے شراب پیتا ہے اور پھر نشے میں ڈاؤن ہو کر اودھم مچاتا ہے۔"

میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "ویسے تو بڑا بھلا مانس اور نیک دل نظر آتا ہے۔"

بوڑھا کہنے لگا: "نہ پوچھیے کتنا زبردست ایکٹر ہے۔ ایسی ایکٹنگ کرتا ہے، میں آپ سے کیا بتاؤں۔ تب ہی تو لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسکے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ میرا کہا مانیے تو بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیجیے۔ چند روز تو بڑا مہربان رہے گا۔ اس کے بعد اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرے گا۔ پھر بے آبرو کر کے سامان کوٹھی سے باہر پھنکوا دے گا۔ میں ایک مدت سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔"

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے بوڑھے کی باتیں سنتا رہا۔ احمد بھی سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

بوڑھا کہتا رہا: "آپ کو میری باتوں کا یقین نہ ہو تو میرے ساتھ چل کر پڑوس کے ان ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لیں۔" اس نے ایک کوٹھی کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "ابھی تو جاگ رہے ہوں گے۔ وہ آپ کو بتائیں گے، کس طرح ہر چار یا پانچ مہینے بعد اس کوٹھی میں کوئی نہ کوئی آ کر ٹھیرتا ہے اور پھر آدھی رات کو اس پر گالیاں پڑتی ہیں۔ کیسے کیسے ذلیل کیا جاتا ہے اور نوکروں سے سامان پھنکوایا جاتا ہے۔"

اس نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "میں تو خدا کے غضب سے ڈرتا ہوں۔ تب ہی تو اس جاڑے پالے میں آپ دونوں کو خبردار کرنے نکل آیا۔ اسے نہ تو کسی کا ڈر ہے، نہ خوف۔ کوڑھی ہو کر مرے گا۔ بدن میں کیڑے پڑیں گے۔" اس نے میری طرف نظر بھر کر دیکھا۔ "صاحب میرا کام آپ کو آگاہ کرنا تھا، وہ میں نے کر دیا۔ آگے جیسے آپ کی مرضی۔"

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں اسے یقین دلایا: "نہیں بڑے میاں، تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"
مگر وہ اصرار کرنے لگا: "یہ رہی سامنے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی۔ ابھی آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ صاحب میں تو بال بچے دار آدمی ہوں، جیسی اپنی عزت ویسی دوسرے کی۔ یہ سالا تو کسی سؤر کا نطفہ ہے۔ نہ جانے اس کا کیا حشر ہو گا۔ دل سے بددعا نکلتی ہے۔"
ہم دونوں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا، توبہ کی کہ بھولے سے بھی کبھی اس طرف کا رخ نہ کریں گے۔

(۳)

خیال تھا کہ اس عبرتناک واقعے کے بعد احمر نے مکان تلاش کرنے کا ارادہ دل سے نکال دیا ہو گا مگر وہ دھن کا پکا تھا، مکان کی ٹوہ میں لگا رہا۔ دن بھر دفتر میں کام کرتا۔ رات گئے تک معمّے حل کرتا اور جب واپس ہوتا تو گلی کوچے ویران ہوتے۔ کتّے اسے دیکھ کر زور زور سے بھونکتے۔
رات کے ایسے ہی سنسان لمحوں میں ایک بار پھر وہ میرے سر ہو گیا۔ میں نے ٹالنا چاہا۔ خفگی کا بھی اظہار کیا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ عاجزی سے بولا: "یہ مکان دفتر کے ایک ساتھی نے بتایا ہے۔ اس کے ایک جاننے والے کا ہے۔ کہتا تھا بڑے معقول آدمی ہیں کسی گڑبڑ کا امکان نہیں۔"
"تو پھر جا کر خود ہی معاملہ طے کر لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "میرے وہاں جانے کی ایسی کون سی ضرورت ہے۔"
کہنے لگا: "جی نہیں آپ کا چلنا ضروری ہے۔"
میں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "میرا وہاں جانا کیوں ضروری ہے۔"
"میرا خیال ہے۔ آپ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے بتایا "کچھ ایسی ہی بات ہے۔"
میں نے لاکھ انکار کیا لیکن وہ خوشامد پر اتر آیا، گڑگڑانے لگا۔ آخر مجھے اس دفعہ بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کے ہمراہ چلنے کی حامی بھرنی پڑی۔
رات گزری۔ صبح ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے دفتر گئے۔ واپسی پر شام کو مکان کے لیے جانے کا

پروگرام بنا۔ گھر سے نکلتے ہی ایک کانا مل گیا۔ کسی کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ مجھ سے ہی اس کی مڈبھیڑ بھی ہوگئی۔ میں مزاج کا کسی قدر وہمی ہوں۔ دل میں شک پڑ گیا۔ جس قدر آگے بڑھتا گیا، شک قوی ہوتا گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ایک بلّی بھی راستہ کاٹ گئی۔ میں فوراً ٹھٹکا۔ آگے جانے کا ارادہ ترک کیا اور احمد کے ساتھ ہی واپس آگیا۔ گھر میں داخل ہو کر ایک گلاس پانی پیا۔ ذرا دیر ٹھیر کر پھر باہر نکلا۔ احمد ہمراہ تھا۔ تمام راستہ خیریت سے کٹا۔ کوئی بدشگونی نہ ہوئی۔ منزل مقصود پر پہنچے۔ وہاں انتظار ہو رہا تھا۔ احمد کے رفیق کار سے بھی ملاقات ہوئی۔ سِن تو اس کا زیادہ نہ تھا مگر تھا بڑا زیرک اور معاملہ فہم۔ نام البتہ بڑا بے تکا تھا۔ دلبند خان۔

فلیٹ ایک چار منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ تین کمرے تھے۔ دو خاصے بڑے تھے۔ ایک قدرے چھوٹا تھا۔ ان صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ جن کا فلیٹ تھا۔ ادھیڑ تھے اور بردبار بھی۔ کسی غیر ملکی فرم میں ملازم تھے۔ گھر کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اپنی ہی طرح پریشان حال آدمی ہیں۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ ٹائم کیپر تھے۔ اور میں ریکارڈ کیپر تھا۔

فلیٹ دیکھ لیا۔ پسند بھی آگیا۔ اب تشویش یہ لاحق ہوئی کہ وہ اچھے بھلے رہتے بستے ہمارے لیے فلیٹ کیوں خالی کرنے لگے اور وہ بھی بغیر پگڑی کے۔ ان سے رسمی سی مختصر بات چیت ہوئی نہ وہ کھلے، نہ میں نے کرید کر حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ذہن میں الجھن برقرار رہی۔ واپسی پر دلبند خاں ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے میری الجھن کو تاڑ لیا۔

کہنے لگا "کہیئے فلیٹ پسند آیا؟" میں جواب دیا "فلیٹ تو اچھا ہے مگر مل جائے تب بات ہے"۔

وہ بولا "بالکل مل جائے گا لیکن ایک شرط ہے"۔

حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا "وہ کیا؟"

دلبند خاں مسکرا کر بولا "احمد کی شادی کر دیجیے اور فلیٹ لے لیجیے"۔

بات پلّے نہ پڑی تجسس کے عالم میں پوچھا "بھئی احمد کی شادی سے فلیٹ کا کیا تعلق؟"۔

وہ بدستور مسکراتا رہا "بہت بڑا تعلق ہے"۔

احمد نظریں جھکائے خاموش چلتا رہا۔ میں بھونچکا ہو کر دلبند خاں کا منہ تکنے لگا۔ اس دفعہ اس نے

سنجیدگی سے کہا: "فلیٹ جہیز میں ملے گا۔"

میں بات کی تہہ تک پوری طرح نہ پہنچ سکا۔ مزید وضاحت چاہی تو دلبند خان نے صاف گوئی سے کام لیا۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ کہنے لگا: "دیکھیے، بات دراصل یہ ہے کہ امجد علی صاحب کی ایک سیانی لڑکی ہے۔ بے چارے مہاجر ہیں۔ دلّی سے لٹ لٹا کر آئے ہیں۔ جہیز وہیز تو ان کے پاس ہے نہیں۔ شربت کے گلاس پر نکاح ہوگا۔ البتہ وہ یہ فلیٹ دے دیں گے۔"

اچھا تو یہ بات تھی جس کی وجہ سے احمد مجھے امجد علی کے گھر لانے پر اس قدر مصر تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تو رضامند تھا۔ یہ اس کی سعادت مندی تھی کہ میری مرضی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ گویا یہ مسئلہ اس نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اب مجھے یہ طے کرنا تھا کہ رشتہ منظور کر لیا جائے یا نہیں۔

دلبند خاں سے رخصت ہو کر گھر آیا۔ بیوی کو پوری بات بتائی۔ رات گئے تک باقاعدہ کانفرنس ہوئی دوسرے روز بھی یہی ذکر چلا۔ کئی روز تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ آخر یہ طے ہوا کہ بیوی آئندہ جمعہ کو پڑوس میں رہنے والی استانی رفیعہ بیگم کے ہمراہ پہلے لڑکی کو دیکھ آئے۔ اس کے بعد شادی بیاہ کی بات چھیڑی جائے۔

خدا خدا کر کے جمعہ کا دن آیا۔ سہ پہر کو میری بیوی اور رفیعہ بیگم بن سنور کے گھر سے نکلیں۔ رکشہ میں بیٹھ کر امجد علی کے فلیٹ پر پہنچیں۔ احمد نے رہنمائی کی۔ وہ دوسرے رکشہ میں سوار تھا۔ بھاوج کو رفیعہ بیگم کے ساتھ فلیٹ کے دروازے پر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

مجھے بیوی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی سمت دیکھتا۔ چراغ جلے واپسی ہوئی۔ دیکھا، بیوی کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ فوراً ماتھا ٹھنکا کہ بات بنی نہیں۔ دھڑکتے دل سے پوچھا: "خیریت تو ہے۔ اس قدر پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟"

تڑ سے جواب دیا: "مجھے تو رشتہ بالکل پسند نہیں۔"

"بات کیا ہوئی، صاف صاف بتاؤ۔"

بیوی نے بتایا: "صاف بات یہ ہے کہ لڑکی صورت شکل کی اچھی نہیں۔ رنگ کالا ہے۔ سن بھی زیادہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگ بھی اچھے نہیں۔ مجھے تو کوئی نیچ قوم معلوم ہوتے

ہیں. گھر کے رکھ رکھاؤ اور بات چیت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔"
احمد بھی اس وقت موجود تھا. بھاوج کی باتیں سن کر اس کا چہرہ مضمحل ہو گیا. چپ چاپ اُٹھ کر باہر چلا گیا. میں نے بھی بیوی سے مزید بات چیت نہ کی. جب کوئی بھی بات ڈھنگ کی نہ ہو تو پھر سوچ بچار کرنا فضول تھا.

بات کے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا کم از کم ہم میاں بیوی نے تو اس رشتے کو مسترد ہی کر دیا تھا لیکن تیسرے یا چوتھے روز دفتر سے واپسی پر احمد نے دبی زبان سے ایک ایسی بات کہی. جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ امجد علی کی بیٹی سے شادی کرنے پر ابھی تک آمادہ تھا. اس نے گھما پھرا کر بات کی. پوچھا۔

"بھائی جان. آپ نے فلیٹ کے بارے میں کیا سوچا؟"

"اس روز تم نے اپنی بھابی کی باتیں تو سن ہی لی تھیں" میں نے بے نیازی سے کہا "اس کے بعد کچھ سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

کہنے لگا "وہ بھابی کی رائے تھی. میری مرضی آپ پوچھیں تو میں یہی کہوں گا کہ اگر فلیٹ ملتا ہے تو ساری باتیں میرے نزدیک ٹھیک ہی ہیں" اس نے کھل کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا.

اس وقت تو میں ٹال گیا لیکن وہ باز نہ آیا. اشارہ کنایہ میں اصرار کرتا رہا. آخر جب میں نے دیکھا کہ وہ اس رشتے پر تلا ہی ہوا ہے تو دل میں کہا خواہ مخواہ رخنہ کیوں ڈالا جائے. لڑکی بدشکل تھی. کالی کلوٹی تھی جیسی بھی تھی. زندگی تو اس کے ساتھ احمد ہی کو بسر کرنا تھی. یہی سوچ کر بیوی کو استانی رفیعہ بیگم کے ساتھ دوبارہ امجد علی کے گھر بھیجا کہ رشتے کی بات پکی کر لی جائے. دونوں وہاں پہنچیں مگر تاخیر سے پہنچیں کوئی اور امیدوار اس دوران وہاں پہنچ گیا تھا. وہ فلیٹ کے لیے احمد سے زیادہ حاجت مند تھا چند ہی روز قبل امجد علی کی بیٹی کے ساتھ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔

(۴)

سردی ختم ہو رہی تھی. گرمی کی آمد آمد تھی. جس کے تصور ہی سے وحشت ہوتی تھی. جاڑے

کی راتیں تو کسی نہ کسی طور کٹ ہی جاتی تھیں۔ لیکن گرمی میں اس غار نما کمرے کے اندر حبس سے دم گھٹتا تھا۔ شام ہوتے ہی گھٹن بڑھتی۔ سانس لینا دوبھر ہوتا پھر بھی پہر رات اس قید خانے میں بسر کرنا ہی پڑتی جب رات کا سناٹا بڑھ جاتا اور گلی میں آمد و رفت کم ہو جاتی تو باہر دروازے کے ساتھ بستر لگائے جاتے۔ یہ ایک اونچی عمارت کے پچھواڑے تھوڑا سا کھلا ہوا حصہ تھا پتھر کا فرش تھا۔ تمام دن چلچلاتی دھوپ میں تپتا تھا۔ بچے دن ڈھلتے ہی چھڑ کاؤ کرتے۔ جلتی زمین کی تپش کم کرنے کی کوشش کرتے۔

لیکن اس جگہ بھی ہمارے لیے چین نہ تھا۔ اوپر فلیٹوں میں رہنے والے اکثر کوڑا کرکٹ کھڑکیوں سے نیچے پھینکتے۔ پان کی پیک تھوکتے اور چوتھی منزل پر رہنے والے وکیل صاحب تو باقاعدہ پیشاب بھی اسی طرف کرتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کئی بار احتجاج کیا۔ خاصا ہنگامہ بھی برپا ہوا مگر وکیل صاحب کے پروگرام میں فرق نہ آیا۔ وہ عام طور پر ایک اور دو بجے کے درمیانی عرصے میں یہ شغل فرماتے تھے۔ اس پُر آشوب وقت کے لیے ہم میاں بیوی میں سے باری باری کسی ایک کی ڈیوٹی مقرر ہوتی۔ ادھر وکیل صاحب شروع ہوئے۔ ادھر بیوی جھٹ مجھے جگاتی۔ ہم دونوں جلدی جلدی بچوں کو جھنجھوڑتے "اٹھو اٹھو بارش ہو رہی ہے" بے چارے نیند سے آنکھیں ملتے اپنا اپنا بستر گھسیٹ کر بھاگتے۔ پہلے پہل تو ہم میاں بیوی وکیل صاحب کو کوستے بھی رہے پھر کوسنا اور بد دعائیں دینا بھی بند ہو گیا اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ سویرے اٹھ کر ہم کو پتہ چلتا کہ رات وکیل صاحب کا پروگرام ہوا تھا اور معمول کے مطابق ہوا تھا۔

گرمی کا موسم جس قدر قریب آ رہا تھا۔ احمد نے مکان کے لیے اسی قدر شدت کے ساتھ دوڑ دھوپ تیز کر دی تھی۔ اسی چکر میں ایک بار خواہ مخواہ گالیاں بھی سننا پڑیں اور پٹتے پٹتے بال بال بچے۔ خاصا دلچسپ اور ہوش ربا حادثہ تھا۔ ہوا یہ کہ احمد مجھے حسب معمول اصرار کر کے ایک صاحب کے پاس لے گیا جو بقول اس کے بڑے خدا ترس اور نیک دل بزرگ تھے۔ دنیا تج کر عاقبت سنوارنے کی فکر میں تھے۔ ساری زندگی مکہ معظمہ میں یاد الٰہی میں بسر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ملاقات ہوئی تو بہت شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ اصرار کر کے چائے پلائی۔ دیر تک زمانے کی بے راہ روی کا رونا روتے رہے۔ بڑھتی ہوئی نفسا نفسی اور خود غرضی پر کڑھتے رہے۔ اخلاقی زبوں حالی

پر خاصا لمبا لیکچر دیا۔ کبھی لہجہ ترش ہو جاتا کبھی شیریں۔ دیر تک جب وہ اپنی نصیحتوں سے فیض یاب کر چکے تو احمد نے دبی زبان سے مُدعا بیان کیا۔ پوچھا۔

"کب تک مکہ معظمہ جانے کا قصد ہے؟"

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے: "دیکھو کب بلاوا آتا ہے" آواز میں رقت تھی آنکھیں پُرنم تھیں "یہاں تو رخت سفر باندھے بیٹھے ہیں" ان کی یہ کیفیت دیکھی تو میں بھی بڑا متاثر ہوا۔ چہرہ بھی ان کا نورانی تھا۔ دودھ کی مانند سفید داڑھی۔ اجلی رنگت، آنکھوں میں سرمہ۔ اس وقت کچھ زیادہ ہی نُور برس رہا تھا۔ کم از کم میں نے تو یہی محسوس کیا۔

احمد نے جھجکتے ہوئے کہا: "فی الحال تو آپ سکھر جائیں گے۔ اس روز یہی فرما رہے تھے"۔

کہنے لگے "بھئی وہاں جانا تو ضروری ہے۔ چاہتا ہوں حرم شریف کے لئے روانگی سے پہلے عزیز و اقارب سے مل لوں۔ سب وہیں ہیں"۔ ایک بار پھر انہوں نے بے قرار ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ "میاں زندگی کا کیا اعتبار، آج مرے، کل دوسرا دن۔ ویسے یہ دنیا اب رہنے کی جگہ بھی نہیں رہی۔ یہ جائے عبرت ہے گناہوں سے بھری ہے۔ اس سے جس قدر جلد چھٹکارا مل جائے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔ پہلے ہی گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوں۔ جب تک سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بوجھ میں اضافہ ہی ہونے کا خوف دامن گیر رہتا ہے"۔ وہ پھر پٹڑی سے اتر گئے۔ ایک بار پھر ان پر وعظ فرمانے کا موڈ طاری ہوا۔

احمد نے فوراً انہیں ٹوکا حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ "کہیے تو تھوڑا سا سامان یہاں پہنچا دیا جائے۔ یاد ہے نا کل آپ ہی نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا"۔

مگر انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ بت بنے سامنے کی دیوار تکتے رہے۔ شامت اعمال میں بول اٹھا "بہر حال یہ تو طے ہے کہ اپنا یہ فلیٹ آپ ہم ہی کو دے کر مکہ معظمہ جائیں گے"۔

بیٹھے بٹھائے دفعتاً نہ جانے ان کو کیا ہوا قہر آلود نظروں سے گھور کر مجھے دیکھا۔ ایک دم جلال میں آگیا۔ چہرے کا نور کافور ہو گیا۔ جھنجلاہٹ چھا گئی۔ آنکھیں سرخ پڑ گئیں۔ نہایت بے رخی سے بولے "میں

اپنا فلیٹ آپ کو کیوں دینے لگا۔ آپ میرے کون سے سگے سوتھرے لگتے ہیں؟" ان کا لہجہ دم بہ دم تلخ ہوتا گیا: "اسی شہر میں میرے دو حقیقی بھانجے موجود ہیں۔ نالائق ہوئے تو کیا ہوا۔ ہیں تو میری بہن کی اولاد۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ عالم یہ تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ احمد نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔ خود کو سنبھالا۔ یاد دہانی کی غرض سے اپنی بات پر زور دے کر بولا: "قبلہ، کل ہی شام کا تو ذکر ہے۔ آپ نے خود ہی فرمایا تھا۔ بار بار یقین دلاتے تھے۔ تسلی و تشفی دیتے تھے۔"

انھوں نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی۔ غصّے سے لال پیلے ہو کر دھاڑے: "آپ سخت احمق اور غبی معلوم ہوتے ہیں جو اس طرح آنکھ بند کر کے میری بات مان لی۔" ان کے ہونٹوں پر زہرخند ابھرا۔ "بھئی حد ہو گئی۔ اللہ نے آپ کو عقل دی ہے۔ اتنا تو سوچا ہوتا کہ کراچی میں کوئی اس طرح پھوکٹ میں کسی کو اپنا فلیٹ دیتا ہے۔ میں نے اسے پانچ ہزار نقد دے کر پگڑی پر لیا تھا۔ کیا سمجھے؟"

احمد سٹ پٹایا۔ حیران و پریشان ہو کر بولا: "آپ نے خود ہی کامل صاحب سے کہہ کر بلوایا تھا۔ میری پریشانی سن کر دیر تک اظہار ہمدردی کیا تھا۔ خود ہی فلیٹ دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ بلکہ میں نے تو پگڑی کے بارے میں پوچھا بھی تھا۔ آپ نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ ایسی بات زبان پر نہ لاؤں۔"

اس نے جلدی جلدی اپنی صفائی پیش کی۔ لہجے میں عاجزی پیدا کی۔ چند لمحے وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر دبی زبان سے گلہ کیا: "سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اچانک اس قدر بدگمان کیوں ہو گئے۔ اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو درگزر کریں۔" وہ گڑگڑا کر معذرت کرنے لگا۔

لیکن اس بندہ خدا پر مطلق اثر نہ ہوا۔ چیخ کر بولے: "کون کامل؟ وہ چرب زبان لفنگا؟" وہ اور بپھر گئے: "تم دونوں بھی مجھے لُچّے لفنگے معلوم ہوتے ہو۔ دھوکہ دے کر میرا فلیٹ ہتھیانا چاہتے ہو۔" ان پر سخت ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ منہ سے کف جاری ہو گیا۔ "تم مجھے الو کا پٹھا سمجھتے ہو۔ میں تمھارا سر توڑ دوں گا۔" انھوں نے جھٹ چائے کی پیالی اٹھائی۔ احمد کے سر کا نشانہ باندھا اور پیالی پھینک کر ماری۔ مگر وہ چوکنا ہو چکا تھا۔ سر جھکا کر ان کا نشانہ صاف بچا گیا۔

پیالی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔ کمرے میں زور کا چھناکا ہوا۔ میرا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ یا الٰہی یہ کیا مصیبت نازل ہوئی۔ خوشی خوشی فلیٹ لینے گئے تھے۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ ہوش ٹھکانے نہ رہے۔

قبل اس کے کہ وہ دوسری پیالی اٹھائیں اور احمد کے سر کا دوبارہ نشانہ باندھیں، وہ اٹھ کر تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ میں اپنی نئی پشاوری چپلیں اتارے اطمینان سے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ احمد کو بھاگتے دیکھا تو چپلیں چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگا۔ اس وقت تک وہ دوسری پیالی اٹھا چکے تھے میں دروازے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ کمر پر بعد سے پیالی لگی اور فرش پر گر کر چکنا چور ہوگئی۔ میں نے نہ چوٹ کی طرف دھیان دیا نہ پلٹ کر دیکھا۔ جھپاک سے باہر نکلا۔

آگے آگے احمد اور اس کے پیچھے میں، دونوں دھڑ دھڑ کرتے، قلانچیں بھرتے، تیزی سے زینے کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے اور ہماری پشت پر ان بزرگوار کی ڈانٹ پھٹکار اُبھر رہی تھی: "ابے ذرا ٹھیر جاؤ میں ابھی تم کو فلیٹ دیتا ہوں۔ اُلو کے پٹھے، حرام زادے، تمہاری تو۔۔۔"

دور تک ان کی گالیوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ خدا معلوم وہ شخص پاگل خبطی تھا یا واقعی میری بات سے مشتعل ہو گیا تھا۔ بہرصورت اس روز دونوں بال بال بچ گئے۔ ورنہ آنکھ ناک ضرور پھوٹتی۔ گھر کے بجائے اسپتال جانا پڑتا۔ بڑے بے ڈھب اور جنونی سے پالا پڑا تھا۔

واپس گھر پہنچ کر میں احمد پر خوب برسا۔ مفت خدا کی ذلت اٹھانی پڑی اور نئی چپل سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ احمد سے صاف صاف کہہ دیا کہ آئندہ مکان کے سلسلے میں بھول کر بھی بات نہ کرے۔ کچھ تو میری خفگی اور کچھ اس آفت ناگہانی کی پشیمانی، وہ اس قدر بد دل ہوا کہ واقعی اس نے مکان کا تذکرہ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد احمد میں طرح طرح کی تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ اب وہ بے حد لاپرواہ ہو گیا تھا اکثر گھر میں کھانا بھی نہ کھاتا۔ ہر وقت اس کے چہرے پر گہرا سکوت طاری رہتا۔ کبھی چھیڑ کر بات کرنے کی کوشش بھی کی تو ہوں ہاں کر کے چپ ہو جاتا۔ ایک انوکھی بات یہ پیدا ہو گئی تھی کہ پیسے پیسے پر جان دینے

لگا تھا پہلے اپنی تنخواہ کے دو سو روپے ہر ماہ لا کر مجھے دیتا تھا۔ اب اس نے یہ سلسلہ یک لخت بند کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کی آمدنی میں اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ سویرے ہی سویرے ایک ٹیوشن کے لئے نکل جاتا۔ دن بھر دفتر میں ڈیوٹی دیتا۔ شام کو کسی فرم میں کام کرتا۔ ماسٹر رحمت علی کے بیان کے مطابق رات کو سٹہ بھی کھیلتا تھا۔

وہ روزانہ بہت تڑکے گھر سے باہر جاتا اور آدھی رات کے بعد لوٹتا۔ صرف اتوار کو گھڑی دو گھڑی کے لئے نظر آتا۔ اس کی صحت بھی برابر گرتی جا رہی تھی۔ چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جواریوں اور سٹہ بازوں کی صحبت میں رہ کر چرس پینے لگا تھا یا قمار بازی میں بے تحاشا ہار رہا تھا۔

میرا شک اس روز اور قوی ہو گیا۔ جب سینما کے سیکنڈ شو سے واپسی پر ایک ایرانی چائے خانے میں اسے چند ایسے افراد کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا جو وضع قطع سے اوباش اور بدقماش نظر آتے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر ان سے خالص بازاری لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سٹے کے بھاؤ کے بارے میں ایک ایک سے پوچھ رہا تھا اور اس شغل میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ میں اس کے نزدیک ہی کھڑا ہوں۔

اس سے بات کرنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ خاموشی سے پلٹا۔ گھر واپس آ کر سوچا کہ مجھے احمد کی جانب سے اس طرح غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ ورنہ وہ بالکل تباہ ہو جائے گا۔ ادھر دو سو روپے ماہانہ کی یافت ختم ہو جانے کے باعث میری بیوی بھی احمد سے سخت برگشتہ تھی۔ بات بات پر طعنے دیتی تھی۔ مجھے بھی اشتعال دلاتی تھی۔

میں سخت ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ احمد کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ انھی دنوں ایک شام دفتر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیوی بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ احمد خلاف معمول دفتر سے جلد ہی واپس آ گیا تھا۔ کسی بات پر بھاوج سے تکرار ہوئی۔ بیوی کے بیان کے مطابق اس نے نہ صرف برا بھلا کہا بلکہ آنکھیں نکال کر مارنے کے لیے بھی کھڑا ہو گیا۔ میں نے خاموشی سے ہر بات سنی اور

اسی وقت طے کیا کہ رات کو واپسی پر احمد سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ وہ اپنے رہنے کا کہیں اور بندوبست کرلے۔ اب وہ میرے لیے ناقابل برداشت بن گیا تھا۔

(۵)

برسات کی اندھیری رات تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا بند تھی سخت اُمس اور گھٹن تھی۔ میں نے بستر نکال کر گھر کے باہر لگایا ہی تھا کہ اچانک بوندیں پڑنے لگیں۔ مجبوراً اندر واپس آگیا۔ اندر حبس اور گرمی سے یہ عالم تھا کہ جسم ابلا جا رہا تھا۔ لاکھ کوشش کی لیکن نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ بے چینی میں خاصی رات گزر گئی۔ آدھی رات کو کسی نے دروازے پر دستک دی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا کہ اتنی رات گئے کون آگیا۔ دروازہ کھولا تو احمد سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک عورت بھی تھی۔

احمد نے کوئی بات نہیں کی، وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا عورت بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر آ گئی۔ احمد نے سوئچ دبا کر بلب روشن کیا۔ عورت کو اسٹول پر بٹھایا اور خود کونے میں رکھا ہوا اپنا ٹرنک کھولنے لگا۔ عورت سیاہ برقعہ پہنے ہوئے تھی مگر چہرے سے نقاب اٹھی تھی۔ رنگ تو اس کا گندمی تھا مگر ناک نقشہ سبک تھا۔ آنکھیں بھی خوب صورت تھیں۔ ان میں عجب سی تیز چمک تھی عمر یہی کوئی ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ تھی۔ میری بیوی بھی اٹھ کر بستر پر بیٹھ چکی تھی۔ میری طرح وہ بھی اس برقعہ پوش عورت کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے کوئی بات نہ کی۔ قریب رکھا ہوا پنکھا اٹھا لیا۔ خاموش بیٹھی پنکھا جھلتی رہی۔ کبھی کبھی نظریں گھما کر احمد کی جانب دیکھ لیتی جو ٹرنک پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی نامعلوم کیا کر رہا تھا۔

عورت بے نیازی سے بیٹھی پنکھا جھلتی رہی۔ ذرا ہی دیر بعد احمد پلٹا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ ہاتھ میں دبا ہوا ریشمی رومال کھول کر عورت کے سامنے کیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ دیکھا رومال میں بہت سے نوٹ رکھے تھے۔

عورت نے رومال اٹھا کر دریافت کیا: "کتنے ہیں؟"

احمد نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا: "سولہ سو بائیس ہیں۔" اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

عورت نے کچھ نہ کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میری سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ یہ کیا ڈراما رچایا جا رہا تھا۔ بیوی بھی حیران و پریشان سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ آخر احمد نے اس پُراسرار خاموشی کو توڑا۔ عاجزی سے بولا "میرے پاس کل اتنی ہی رقم ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا فلیٹ چار ہزار سے کم پگڑی پر نہ جائے گا لیکن میں بہت غریب آدمی ہوں۔ خدا بہتر جانتا ہے میں بہت غریب ہوں" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ بے اختیار رو پڑا۔ آنسوؤں کے قطروں سے اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"ارے یہ آپ کو کیا ہو گیا" وہ مسکرا کر بولی "مرد ہو کر زنانیوں کی طرح ٹسوے بہانے بیٹھ گئے میں نے جی فلیٹ آپ کو دیا اور یہ روپے بھی اپنے پاس ہی رکھیے۔"

اس نے رومال نوٹوں کے ساتھ احمد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے غور کیا۔ احمد کا چہرہ اس وقت خاصا ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں۔ اس نے رومال کی جانب دیکھا اور بڑی بھونڈی آواز میں روتے ہوئے بولا "نہیں میں یہ روپے واپس نہیں لوں گا" وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

وہ بڑی دبنگ عورت تھی کہنے لگی "میں نے یہ روپے نہیں لینے۔ اگر لوں تو میرے کفن میں لگیں۔"

احمد کے لیے مزید اصرار کرنے کی گنجائش نہ رہی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد وہ میری جانب مخاطب ہوئی "میرا نام بختاور ہے جی، ہوں تو کنجری، پر دل چھوٹا نہیں رکھتی۔ اللہ میرے دھندے میں برکت دے۔ بہت کمائی کر لوں گی۔ پروا نہ کریں جی!"

میں گم صم بیٹھا رہا۔ احمد بھی چپ رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سولہ سو بائیس روپے رومال میں لپٹے ہوئے دبے تھے۔ بختاور نے برقعہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ پھول دار ریشمی قمیض اور لٹھے کی اجلی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جسم سڈول تھا۔ قد نکلتا ہوا تھا۔ کولہے قدرے بھاری تھے۔ لباس سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ بھرپور جوان اور طرح دار عورت تھی۔

حبس سے دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سخت گرمی تھی۔ بجنتاور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور زور زور سے پنکھا جھلتے ہوئے بولی "یہاں تو جی سخت گرمی ہے۔ میرا کہا مانیے تو کچھ سامان لے کر ابھی میرے ساتھ چلیے۔ اس جگہ تو رات کاٹنی عذاب ہو جائے گی۔"

"ہمیں تو اس دوزخ میں رہتے ہوئے سات سال ہو گئے ہیں۔" یہ میری بیوی کی آواز تھی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر اپنا دکھ بیان کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر بجنتاور اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ کہنے لگی "بھین جی، میں نے آپ کو اس کھولی میں اب نہیں رہنے دینا۔"

بجنتاور نے اصرار کر کے احمد سے وکٹوریہ منگوائی۔ بار بار انکار کے باوجود اس نے میری بیوی اور اس کے ساتھ بچوں کو سوار کرا دیا۔ کچھ ضروری سامان اس میں رکھا۔ گھر کے دروازے پر قفل ڈالا گیا۔ بجنتاور نے برقعہ اوڑھا۔ وکٹوریہ میں جا کر بیٹھی۔ مجھے اور احمد کو بھی بٹھایا۔ وکٹوریہ آگے بڑھی۔ بوندا باندی رک چکی تھی۔ سڑک گیلی تھی۔ وکٹوریہ میں جتا ہوا گھوڑا سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے رات گرم اور اندھیری تھی۔

راستے بھر میں اور احمد خاموش رہے۔ بیوی بھی گم صُم بیٹھی تھی۔ بچے نیند سے جھوم رہے تھے۔ بجنتاور نے پرس کھولا۔ سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ سلگائی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ٹھاٹھ سے سگریٹ کے کش لگاتی رہی۔ پھر اس نے خود ہی بتایا کہ اب وہ حیدر آباد جا کر دھندا شروع کرے گی۔ کراچی میں چوری چھپے عصمت فروشی کرتی تھی۔ پولیس سے زیادہ پاس پڑوس والے پریشان کرتے تھے۔ بات بات پر گالیاں دیتے تھے۔ آوازے کستے تھے۔ رات کو گھر میں پتھر پھینکتے تھے۔ اسے سب سے زیادہ شکوہ آس پاس کے فلیٹوں میں رہنے والی عورتوں سے تھا۔ وہ اسے دیکھ کر جھٹ منہ چھپا لیتیں۔ منہ بگاڑ کر نفرت سے تھوکتیں۔

بات کہتے کہتے وہ ایک بار بڑے جوش سے بولی "میں تو جی تنگ کرنے والوں میں سے ایک ایک کو ٹھیک کر دیتی۔" اس نے پھٹ سے گالی دی اور ان کی ماؤں کے ساتھ ایسا خطرناک رشتہ جوڑا کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔ خوف دامن گیر ہوا کہ میری بیوی کو ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے۔ واللہ بڑی مردمار عورت

تھی۔ بے دھڑک ہر بات کہتی تھی۔ ذرا نہ جھجکتی۔

آخر وکٹوریہ اس بلڈنگ کے سامنے جا کر رکی۔ جس میں اس کی رہائش تھی۔ وکٹوریہ کا کرایہ بھی اس نے ضد کر کے اپنے پاس سے دیا۔ آگے آگے وہ چلی، پیچھے پیچھے ہم سب زینے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اوپر پہنچے۔ اس نے بڑھ کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ پوچھا "کون ہے؟" بختاور بولی "میں ہوں بختاور۔ ساتھ میں مہمان بھی ہیں" وہ دندناتی ہوئی اندر داخل ہو گئی مگر فوراً ہی پلٹی۔ باہر آئی۔ میری بیوی کو مخاطب کیا "بہن جی ذرا دم لینا" اس نے مڑ کر بوڑھی عورت سے کہا۔

"بی بی، اندر سے ایک کوئلہ تو لا کر دینا۔"

ہم لوگ دروازے پر چپ چاپ کھڑے رہے۔ ذرا دیر بعد بوڑھی عورت نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر کوئلہ لائی۔ بختاور نے کوئلہ ہاتھ میں لیا۔ دہلیز کے سامنے فرش پر کوئلہ سے پانچ آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں پیر سے جوتی اتاری۔ پھٹا پھٹ سات بار لکیروں پر ماری۔ میری بیوی کی جانب مڑی مسکرا کر بولی۔

"بہن جی پہلے آپ نے اندر جانا ہے۔"

وہ اندر چلی گئی۔ اس کے بعد ہم سب داخل ہوئے۔ پتہ نہیں کیا ٹوٹکہ تھا۔ یہ بات تو کوئی طوائف ہی بتا سکتی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں نہ بختاور سے کرید کر پوچھا اور نہ ہی اس نے کوئی وضاحت کی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ خوش نظر آرہی تھی۔ اندر جا کر دیکھا۔ فلیٹ میں تین کمرے تھے۔ نہایت صاف ستھرے اور ہوادار تھے۔ بیٹھتے ہی کھلی کھڑکی سے ایسا جھونکا آیا کہ روح میں تازگی آگئی۔

دوسرے ہی روز بختاور نے حیدرآباد کے لیے اپنا سامان باندھا۔ جو کچھ ساتھ لے جا سکتی تھی لے گئی۔ جو بچ گیا چھوڑ گئی۔ میرے بار بار اصرار کرنے پر بھی نہ لے گئی۔ شام ہونے سے پہلے، پہلے ریل گاڑی میں سوار ہو کر کراچی سے چلی گئی۔ اس کے رخصت ہوتے ہی احمد گھوڑوں کے سابق اصطبل سے سارا سامان اٹھوا کر فلیٹ میں لے آیا۔ رات گئے تک قرینے سے لگانے میں مصروف رہا۔ وہ بہت خوش و خرم نظر آرہا تھا۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ چہرے پر رونق آگئی تھی۔

میں تو اول ہی شب لمبی تان کر سو گیا تھا۔ سویرے آنکھ کھلی تو گھر میں ہنگامہ برپا تھا۔ بچے چہک

رہے تھے۔ بیوی بات بات پر ہنس رہی تھی۔ احمد فجر کی اذان کے وقت اٹھ بیٹھا تھا اور سامان اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر جما رہا تھا۔ ایک کمرہ اس نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اس کے لیے نیا فرنیچر خرید کر لانے کے لیے بھاوج سے صلاح مشورے کر رہا تھا۔

بیوی نے اس روز نہایت اہتمام سے کھانا پکایا تھا۔ نہ میں دفتر گیا تھا اور نہ ہی احمد۔ سویرے سویرے سب نے غسل کیا۔ اجلا لباس پہنا۔ سب ہی مسرور تھے۔ سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ کھانا بھی سب نے ساتھ بیٹھ کر نہایت رغبت سے کھایا۔ یہ فلیٹ میں پہلا دن تھا۔ خوشی اور مسرت کا امڈتا ہوا سیلاب دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہماری زندگی میں ایک نیا سورج طلوع ہوا تھا۔

فلیٹ میں منتقل ہوتے ہی احمد یکسر بدل گیا تھا۔ اب اس نے رات گئے تک گھر سے باہر رہنے کی عادت ترک کر دی تھی۔ شام کو دفتر سے سیدھا گھر آتا۔ چائے پیتا اور کوئی کتاب یا رسالہ اٹھا کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ بچوں کے ساتھ مل کر کھیلتا۔ انھیں ہنساتا خود بھی ہنستا۔ قہقہے لگاتا۔ بھاوج کے ساتھ بیٹھ کر لمبی چوڑی باتیں کرتا۔ سینما دیکھنے یا سیر سپاٹے کے پروگرام بناتا۔ دن اسی طرح ہنسی خوشی گزرتے رہے۔

کچھ ہی عرصہ بعد کا ذکر ہے۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ ہلکی ہلکی نرم ہوا چل رہی تھی۔ سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ دور سمندر کے کنارے روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ایک جہاز بار بار بھونپو بجا کر روانگی کا اعلان کر رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں دور سے ابھرتی ہوئی یہ آواز، جھلملاتی روشنیاں، نرم نرم جھونکے بڑی خوشگوار اور سہانی فضا تھی۔ میں بالکنی میں لیٹا چاروں طرف بکھری ہوئی خوب صورتی اور دل کشی سے خوابوں کے جزیرے آباد کر رہا تھا اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔

احمد بے خبر سو رہا تھا لہٰذا مجھے اٹھنا پڑا۔ جا کر دروازہ کھولا۔ اندھیرے میں ایک شخص خاموش کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا: "فرمائیے کس سے ملنا ہے؟"

وہ تو خاموش رہا۔ البتہ اس کی پشت پر سے آواز ابھری: "سیٹھ کو اندر جانے دو۔ اپنے ہی آدمی ہیں۔" اس کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا۔ مجھے خاموش پا کر وہ سامنے آگیا۔ میلا کچیلا لباس۔ الجھے ہوئے بال، کالا کلوٹا چہرہ۔ میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پان کی جگالی کرتے ہوئے وہ آنکھ مار کر بے تکلفی

سے مسکرایا "کوئی گڑبڑ والا معاملا نہیں ہے۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ اماں حیران کیوں ہو رہے ہو۔ میں کلن رکشے والا ہوں۔ کشمیرے کر آیا ہوں" اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ غصہ تو بہت آیا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کلن کا بھی قصور نہ تھا۔ اسے پتہ نہ تھا کہ بجنا در فلیٹ خالی کر کے حیدر آباد جا چکی تھی۔ میں نے نرمی سے کام لیا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا۔ الجھنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے سختی سے منع کیا تو وہ دھیما پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے وہ لوں ٹلے۔

میں واپس آیا بیوی جاگ رہی تھی۔ اسے بھی کچھ نہ بتایا۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ نیند کا غلبہ بڑھا ہی تھا کہ دروازے پر پھر دستک سنائی دی۔ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ دروازہ کھولا تو شراب کا ایسا بھبکا آیا کہ میں چکرا گیا۔ سامنے ایک تنومند آدمی کھڑا تھا۔ جھوم کر بولا۔

"یہ دروازہ آج اتنی دیر میں کیوں کھلا۔ کوئی ایڈوانس بکنگ کر رکھی ہے؟"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر میرے شانے کو تھپ تھپایا۔ مسکرا کر کہا "یار، راستہ تو چھوڑ خاما خا دروازہ روکے کھڑا ہے۔ وہ اپنی بلوجان کدھر ہے۔ اس کے لیے سات میل چل کر آیا ہوں" وہ نہایت بدتمیزی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے ضبط سے کام لیا۔ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر وہ نشے میں دھت تھا۔ اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ کہنے لگا "جانے تو نے کیا انٹ شنٹ لگا رکھی ہے۔ ہم کوئی آج ادھر نئے آئے ہیں۔ جو تو اس طرح اپن کو ٹرخا دینا چاہتا ہے" اس نے ایک زنانٹے کی گالی دی "کہاں چھپی بیٹھی ہے وہ حرام زادی۔ اسے باہر بلا" میں نے پاس پڑوس والوں کے ڈر سے بات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ غصے کو دبایا۔ نرمی سے سمجھایا مگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ اور مشتعل ہو گیا۔ زور زور سے چنگھاڑنے لگا۔

شور سن کر احمد بھی دروازے پر آگیا میں نے ابھی تک اپنے ابلتے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھا تھا۔ اسے بار بار منع کر رہا تھا کہ آہستہ بولے لیکن میرے نرم رویے سے وہ شیر ہو گیا۔ نشے میں بہکنے لگا۔ زور زور سے بولتا۔ گندی گندی گالیاں بکتا۔ احمد بھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ کچھ دیر تو وہ ہکا بکا کھڑا رہا اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا مگر گالیاں سن کر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ جھپٹ کر شرابی کا گریبان پکڑا۔ جھنجھوڑا اور اس قدر زور کا دھکا دیا کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ تھا بھی خوب موٹا تازہ۔

فرش پر چاروں شانے چت لیٹا تھا اور زخمی بھینسے کی طرح ڈکرا رہا تھا۔

چیخ پکار سے بلڈنگ کے دوسرے فلیٹوں میں رہنے والے بھی جاگ گئے۔ گھبرائی ہوئی ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ دروازے کھلے اور آن کی آن میں میرے دروازے کے سامنے بھیڑ لگ گئی۔

پڑوسیوں کو حقیقت سے آگاہ کرنے یا صفائی پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ وہ پہلے ہی واقف تھے۔ اکثر رات گئے اس فلیٹ کے سامنے ایسے واقعات دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے فرش پر پڑے ہوئے شرابی کو اٹھایا۔ لعنت ملامت کی۔ دو چار ہاتھ بھی لگائے اور اسے دھکے دیتے ہوئے نیچے لے گئے۔ احمد بھی اُن کے ساتھ ساتھ تھا۔ خدا خدا کر کے ہنگامہ ختم ہوا اور میں سر جھکائے خاموشی سے گھر کے اندر آ گیا۔

اب اکثر میرے دروازے پر ایسے ہنگامے ہوتے۔ ان سے نمٹنے کے لیے مجھے اور احمد کو آدھی رات تک جاگنا پڑتا۔ ویسے جب بھی ہنگامہ برپا ہوتا۔ پڑوسی فوراً ہماری مدد کو پہنچ جاتے مگر پیٹھ پیچھے طرح طرح کی باتیں بناتے۔ میری بیوی ان باتوں کو سن کر سخت پریشان ہوتی۔ وہ سہمی سہمی رہتی۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ میری صحت بھی گرنے لگی تھی۔ رات گئے ذرا آنکھ لگتی۔ اچانک دروازے پر دستک سنائی دیتی۔ میں نیند سے بوجھل آنکھوں کو ملتا بار بار اٹھتا، پہلے گرمی اور حبس کے مارے نیند نہ آتی تھی۔ اب ان قسم قسم کے اوباشوں اور رنڈی بازوں نے میری نیند حرام کر دی تھی۔

آئے دن کی اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور وہ یہ تھا کہ اس فلیٹ کو پگڑی پر کسی کو دے دوں اور پگڑی کی رقم سے کوئی دوسرا فلیٹ لے لوں۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

(۶)

ایک روز صبح اٹھ کر اخبار دیکھا معلوم ہوا کہ ملک میں مارشل لاء گیا تھا۔ ایوب خاں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے تھے۔ شہر میں ہر طرف فوج گشت کرتی نظر آتی تھی۔ جگہ جگہ فوجی عدالتیں قائم تھیں۔ آئے دن نت نئے آرڈی ننس اور مارشل لاء کے ضابطے نافذ کیے جاتے۔ چوری چکاری، منافع خوری، چور بازاری ذخیرہ اندوزی، رشوت خوری غرضیکہ ہر طرح کی دھوکہ فریبی اور بدعنوانی کے لیے سخت سے سخت سزائیں دی

جاتیں۔ قید با مشقت کے ساتھ ساتھ جرمانہ ہوتا اور کوڑے بھی لگائے جاتے۔

اس ہنگامہ دار و گیر میں پگڑی پر فلیٹ دینے کا صاف مطلب یہ ہوتا کہ فلیٹ بھی ہاتھ سے جاتا اور جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی۔ لہٰذا میں نے فلیٹ بدلنے کا خیال دل سے بالکل نکال دیا۔

ویسے اب فلیٹ چھوڑنے کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ گلی کوچوں نالیوں اور جوہڑوں کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ہر طرف بکھری ہوئی غلاظت اور گندگی صاف کرنے کی مہم زور شور سے جاری تھی۔ یہ دور بھی عجب دور تھا۔ پولیس سوتے سوتے جاگ اٹھی تھی۔ دکانوں پر، گوداموں پر، قمار بازی کے اڈوں پر، قحبہ خانوں پر چھاپے پڑتے۔ پکڑ دھکڑ ہوتی۔ مقدمے چلتے۔ سزائیں ہوتیں۔ اس عالم میں بختاور کے گاہکوں اور بھڑوؤں نے بھی میرے فلیٹ کی جانب رخ کرنے سے توبہ کر لی تھی۔ رات گئے میرے دروازے پر ہونے والے ہنگامے ختم ہو چکے تھے۔ میں اب بے کھٹکے سوتا اور خوب گہری نیند سوتا۔

چند مہینے بھی سکون سے نہ گزرے تھے کہ ایک رات دروازے پر دستک ابھری۔ آنکھ کھل گئی۔ مگر خاموش لیٹا رہا۔ دستک رک رک کر ابھرتی رہی۔ ناچار اٹھا۔ دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولا۔ سامنے ایک شخص مشتبہ انداز میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سرگوشی کے انداز میں بولا "میں شیدا ہوں جی۔ سرگودھا چلا گیا تھا۔ اب واپس آ گیا ہوں۔ بختاور مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔"

میں نے اسے بتایا "بختاور اب یہاں نہیں رہتی۔"

"میں نے سب پتہ ہے جی۔" وہ اپنے گندے دانت نکال کر مسکرایا۔ "ڈرنے سٹرنے کی کوئی گل بات نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

اس بار میں نے اسے ڈانٹا "فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ "پولیس کی فکر نہ کریں جی۔ ادھر سب اپنے ہی بندے لگے ہیں۔"

میں نے درشت لہجے میں ایک بار پھر اسے آگاہ کیا۔ "دیکھو میں تم کو پہلے ہی بتا چکا ہوں، بختاور یہ فلیٹ چھوڑ کر حیدر آباد چلی گئی۔ سن لیا تم نے؟"

"سن لیا، بالکل سن لیا۔" وہ اسی طرح جما کھڑا رہا۔ "بہت اونچا گاہک ہے جی۔ رات بھر کے سو

روپے دے گا۔" اس نے بدمعاشی سے ایک آنکھ دبائی میری پشت کی جانب اشارہ کیا۔" بختاور نہیں ہے تو کیا ہوا، یہ بھی چل سکتی ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بیوی دروازے کا ایک پٹ کھولے کھڑی تھی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اوسان خطا ہو گئے۔ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ شیدے کی آواز ابھری۔"میں جی اسے لے کر ابھی آیا۔" وہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔

واپس گھر کے اندر آیا تو صدمے اور خفت سے برا حال تھا۔ بیوی سے نظریں بھی نہ ملا سکا۔ وہ بھی خاموش رہی۔ میں نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ چپ چاپ جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ غم و غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کان دروازے پر لگے تھے۔ مجھے شیدے کا انتظار تھا۔

چند ہی منٹ بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ باورچی خانے میں گیا۔ سبزی کاٹنے کی چھری اٹھائی اور دروازے کی جانب بڑھا۔ غصے اور جھنجلاہٹ سے سارا بدن کپکپا رہا تھا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ اسی غیظ و غضب کے عالم میں دروازہ کھولا۔ سامنے شیدا نہیں بختاور کھڑی تھی۔ بختاور اس وقت بھی سیاہ برقعہ اوڑھے ہوئے تھی۔ میں ہکا بکا کھڑا اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

مجھے خاموش پا کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔" کیا میں اب اندر بھی نہیں جا سکتی؟"

میں فوراً چونکا مسکرایا اور نرم لہجے میں بولا۔" تم کو اندر آنے سے کون روک سکتا ہے۔ آؤ اندر آجاؤ۔" بختاور سے اور کہتا بھی کیا۔ ظاہر ہے اسے گھر میں داخل ہونے سے کیسے منع کر سکتا تھا۔

وہ اندر چلی گئی۔ برقعہ اتار کر ایک طرف رکھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی میری بیوی کو دیکھا۔ اس کی طرف بڑھی۔ بختاور کو دیکھتے ہی وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔ بختاور ہنستی مسکراتی اس کے قریب پہنچی اور بے تکلفی سے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔" میں جی حیدرآباد سے واپس آگئی ہوں۔ ادھر اپنا دھندا چلا نہیں۔"

غصہ تو میرا پہلے ہی ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ چھری کو میں نے بختاور کی آنکھ بچا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ مگر اس کی بات سن کر میں پریشان ہو گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی جو بات کہی تھی۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ

وہ اپنا فلیٹ لینے آئی تھی۔ میری بیوی نے بھی غالباً یہی اندازہ لگایا تھا۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے لیکن بختاور زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ کہنے لگی: ”آپ دونوں چپ کر کے کیوں بیٹھے ہیں۔ لگتا ہے آپ کو میرا یہاں آنا بُرا معلوم ہوا۔“

”بختاور تم ایسی بات کیوں کہہ رہی ہو۔ تمہارا گھر ہے جب جی چاہے آؤ۔“ میں نے اس کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی۔ ”تم ٹھہری کہاں ہو؟“

اس نے بتایا: ”ابھی تو جی ہوٹل میں ہوں۔ پر جلد ہی ٹھہرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“

”تب تو تمھیں اپنے فلیٹ کی ضرورت پڑے گی۔“ بیوی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے بھی دل پر پتھر رکھ کر بختاور کو یقین دلایا: ”تم جب کہو گی، ہم فلیٹ خالی کر دیں گے۔“

”آپ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں جی۔“ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی: ”آپ نے مجھے اتنا گرا ہوا کیوں سمجھا۔“ اس کے لہجے سے تلخی صاف جھلک رہی تھی۔ اس نے قدرے توقف کیا ٹھنڈی سانس بھری۔ دل گرفتہ ہو کر بولی: ”میں کنجری ہوں ناں۔ تب ہی آپ نے میرے بارے میں ایسا سوچا۔“

”ارے ارے تم تو بہت بُرا مان گئیں۔“ میں نے اسے منانے کے لیے بے تکلفی سے کہا۔

”بُرا منانے کی جی بات ہی ہے۔“ وہ بدستور ناراض تھی۔

اس بار بیوی نے اس کی خفگی دور کرنے کی کوشش کی: ”اچھا، اب تم غصہ تھوک دو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ پلنگ سے نیچے اتری۔ بختاور منع کرتی رہی مگر وہ نہ مانی۔ باورچی خانے میں چلی گئی۔

بختاور میری طرف متوجہ ہوئی۔ صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولی: ”میں تو آپ لوگوں کی خیر خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ میں نے اب اس فلیٹ سے کیا لینا۔ یہ تو آپ کا ہے۔ میں نے تو اسے واپس لینے اور خالی کرانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔“

معاً مجھے شیدا یاد آ گیا۔ دل کی بات فوراً زبان پر آ گئی: ”تم چاہو یا نہ چاہو۔ یہ فلیٹ تو مجھے چھوڑنا ہی پڑے گا۔“

”کیوں جی، آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟“ اس کے انداز میں تجسّس تھا۔

میں نے اس دفعہ صاف گوئی سے کام لیا۔"شیدا کو تو تم جانتی ہی ہوگی۔ تمہارے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہ یہاں آیا تھا۔ دوبارہ آنے کو کہہ گیا تھا۔ آتا ہی ہوگا۔" میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر چھری کو ٹٹولا۔ "اگر وہ آیا تو میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گا۔" میں ایک دم بھڑک اٹھا۔

"میں نے سب پتہ ہے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔" اس نے میرے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "آپ فکر نہ کریں جی، وہ اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔" اس نے میرے چہرے کی جانب دیکھا جس پر چھایا ہوا غصہ رفتہ رفتہ پگھل رہا تھا۔ "شیدا مجھے باہر ہی مل گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کی بات ہوئی تھی۔ اب وہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

میں نے اپنی پریشانی بتائی۔ "یہ پہلا موقع نہیں۔ تمہارے جانے کے بعد ہر رات کوئی نہ کوئی آجاتا۔ وہ ہنگامہ برپا ہوتا کہ میں تم سے کیا بتاؤں۔ مجھے ڈر ہے کہ پھر وہ سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔"

"نہیں جی۔ اب میرا کوئی دلا کوئی یار ادھر نہیں آئے گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔ "میں سب کو سختی سے منع کر دوں گی۔ آپ آرام سے رہیں۔ بالکل فکر نہ کریں۔"

بیوی چائے لے آئی۔ بختاور نے چائے پی۔ برقعہ اوڑھا جانے کی اجازت چاہی۔ میں اسے رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ چاہا کہ اس کے ہمراہ نیچے جاؤں مگر اس نے منع کر دیا۔ باہر کلّن اپنے رکشا میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے چلی گئی۔

دوبارہ آئی اور اکثر آتی رہی۔ جب بھی آتی۔ بچوں کے لیے مٹھائی یا پھل ضرور لاتی۔ کبھی خالی ہاتھ نہ آئی۔ اس میں ایک نئی تبدیلی یہ محسوس کی کہ اب وہ میرے سامنے سگریٹ ہرگز نہ پیتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوپٹے کا پلو کھینچ کر سر کو ڈھک لیتی۔ کم بولتی اور جب بولتی تو بازاری لہجہ اختیار نہ کرتی۔ کئی مہینے اس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایسی غائب ہوئی کہ عرصہ دراز تک نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کراچی چھوڑ کر پھر کہیں چلی گئی۔

مگر اس نے جیسا کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ اس کا کوئی یار آشنا یا بھڑوا کبھی میرے دروازے پر نہ آیا۔ رہائش کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ فلیٹ میں آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ البتہ احمد کے رویے میں ایک نئی تبدیلی

دیکھنے میں آئی۔ وہ رات کو دیر سے لوٹتا اور کبھی کبھار رات بھر نہ آتا، پھر ایسا ہوا کہ وہ کئی کئی روز گھر سے غائب رہنے لگا لیکن جب آتا تو کوئی نہ کوئی عذر پیش کرتا۔ معذرت کرتا۔

اب اس کا رنگ روپ بھی نکھر گیا تھا۔ خوش حالی اس کے بشرے سے ٹپکتی تھی۔ لباس بھی عمدہ پہنتا۔ جیب بھی اس کی خالی نہ رہتی۔ بچوں کو کبھی روپے سے کم نہ دیتا۔ ان کے لیے کھلونے اور کپڑے خرید کر لاتا۔ میرے لیے اور اپنی بھاوج کے لیے بھی آئے دن کچھ نہ کچھ خرید کر لاتا۔ خود بھی ہشاش بشاش رہتا۔ اور گھر والوں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔

ایک بار وہ ہفتہ بھر تک گھر نہ آیا۔ پہلے ہی میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور شبہات کلبلا رہے تھے۔ اس طویل غیر حاضری نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ان دنوں میں کھویا کھویا رہتا۔ احمد کے بارے میں مسلسل سوچتا رہتا۔

بیوی نے مجھے مضمحل اور چپ چپ دیکھا تو ایک رات کرید کر پوچھا۔ "آپ آج کل بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔"

"پریشانی کی بات ہی ہے"۔ میں نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔ "احمد ہفتہ بھر سے گھر نہیں آیا اور یہ پہلا موقع نہیں۔ ایک مدت سے اس نے یہی وتیرہ اختیار کر رکھا ہے۔ کئی کئی روز غائب رہتا ہے۔ اس نے تو حد کر دی۔ نہ جانے کہاں رہتا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے"۔ بیوی نے بتایا۔

میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ "کہاں رہتا ہے وہ؟"

اس نے دبی زبان سے کہا۔ "وہ بختاور کے ساتھ رہتا ہے۔ اس وقت بھی وہیں ہو گا۔"

مجھے یقین نہ آیا۔ اپنے شبے کا برملا اظہار کیا۔ "تم کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بختاور کے ساتھ رہتا ہے؟"

"یہ بات مجھے معلوم تو بہت دن سے ہے مگر اس ڈر سے کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ آپ ناراض ہوں گے"۔ اس نے صفائی پیش کی۔ "آپ کو تو یہ بھی خبر نہ ہو گی کہ احمد نے چھپ کر بختاور سے نکاح بھی کر لیا ہے۔ ویسے بختاور سے آشنائی تو پہلے سے تھی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ تڑپ کر بولا" تم سچ کہہ رہی ہو؟"

" اب تو بات پرانی ہوگئی ہے۔ خود بختاور نے مجھے بتائی تھی" اس نے وضاحت کی" ہوا یہ کہ پچھلے مہینے بختاور آپ کی غیر موجودگی میں آئی تھی۔ مجھے سب کچھ بتا گئی تھی۔ یقین نہ ہو تو تصدیق کر کے دیکھ لیں"

میں دم بخود رہ گیا۔ اس وقت تو خاموش رہا۔ دوسرے روز دفتر سے چھٹی لی۔ احمد کے دوست دلبند خان سے ملا۔ پہلے تو اس نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ احمد کے بارے میں کچھ بتانے سے اجتناب برتا۔ صاف ٹرخانے کی کوشش کی مگر جب کرید کر پوچھا تو وہ کھلا۔ سب کچھ اگل دیا۔ بیوی کی بات بالکل درست نکلی۔ احمد نے واقعی بختاور سے نکاح کر لیا تھا، جس میں دلبند خاں گواہ کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔ احمد اب بختاور ہی کے ساتھ رہتا تھا۔

یہ بھی عقدہ کھلا کہ بختاور نے عصمت فروشی کا دھندا ختم نہیں کیا تھا۔ بلکہ اعلیٰ پیمانے پر اور زیادہ سلیقے سے جاری تھا۔ اب وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کی ایک شاندار کوٹھی میں رہتی تھی۔ جہاں شراب کا دور چلتا تھا۔ قمار بازی بھی ہوتی تھی۔ اس کے یار آشنا بھی بدل گئے تھے۔ رکشاؤں کے بجائے چمکتی دمکتی کاروں میں آتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار بھی شامل تھے۔ اور بڑے افسر بھی۔ بختاور اپنے کاروبار کی روز افزوں ترقی سے بہت خوش تھی۔ احمد بھی خوش وخرم تھا۔ بختاور کے کاروبار کو نہایت منظم طریقے پر چلا رہا تھا۔ جس نسخہ کیمیا کی سال ہا سال سے تلاش تھی، اب احمد کے ہاتھ آگیا تھا۔ بختاور اس کے لیے واقعی بخت آور ثابت ہوئی تھی۔

ان حالات کا علم ہوا تو میری عزت نفس کو ایسا دھچکا لگا کہ تڑپ کر رہ گیا۔ سوچا کہ احمد میرے پاس آیا تو اسے کھڑے کھڑے نکال دوں گا۔ صاف صاف کہہ دوں گا کہ آئندہ میرے گھر میں قدم نہ رکھے مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ احمد نے خود ہی آنا جانا ترک کر دیا۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا پیچ و تاب کھاتا رہا۔

(۷)

جنوری کا مہینہ تھا۔ صبح سے آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ہوا بھی بپھری ہوئی تھی۔ سردی پہلے

ہی کم نہ تھی۔ دن ڈھلے بوندا باندی شروع ہو گئی تو سردی میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ شام کو دفتر سے لوٹا تو سردی سے کپکپا رہا تھا۔ بدن پہ صرف ایک اونی سوئٹر تھا اور وہ بھی اتنا بوسیدہ تھا کہ اس میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے۔ یہ پھٹا پرانا سوئٹر کڑاکے کی اس سردی میں بھلا کیا کام دیتا۔ جب سے سردی شروع ہوئی تھی۔ برابر سوچتا رہا کہ "لنڈے" سے ایک سیکنڈ ہینڈ کوٹ خرید لاؤں، مگر تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ گذر بسر ہی مشکل سے ہوتی تھی۔ پرانا کوٹ خریدنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

سردی سے سکڑا سکڑایا گھر میں داخل ہوا۔ دیکھا، احمد ٹھاٹھ سے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ تو وہ ایک عرصے سے پی رہا تھا مگر چھپ کر پیتا تھا۔ مجھے دیکھتا تو جھٹ سگریٹ مٹھی میں چھپا لیتا۔ فوراً کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ادھر ادھر کھسک جاتا تھا۔ میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا لیکن اس وقت بغیر کسی جھجک کے سگریٹ پیتا رہا۔ ذرا بھی میرا لحاظ نہ کیا۔

میں پہلے ہی اس کی حرکتوں سے نالاں تھا۔ اس ڈھٹائی پہ تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ لیکن ضبط سے کام لیا۔ بے رخی سے اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھنا چاہا تو اس نے ٹوکا۔

"بھائی جان، آپ کہاں چلے؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بادل نخواستہ دزاہٹ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

لیکن وہ خاموش نہ رہا۔ اس نے اپنی چمکتی دمکتی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ "یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ کس غضب کی سردی پڑ رہی ہے اور آپ نے یہ نہ جانے کب کا پرانا سوئٹر پہن رکھا ہے۔"

میں تڑپ کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ اس سے کہوں۔ میں کسی بختاور کی بھڑوائی نہیں کھاتا کہ سوٹ بوٹ پہن کر اکڑا اکڑا پھروں۔ حق حلال کی کمائی میں تو پرانا دھرانا سوئٹر ہی پہن کر جاڑا کاٹا جا سکتا ہے۔ میں نے اسے قہر آلود نظروں سے گھور کر دیکھا لیکن وہ ذرا مرعوب نہ ہوا۔ بدستور مسکراتا رہا۔ اٹھا اور میرے قریب آ کر بیٹھ گیا

میں منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس نکالا۔ اسے کھولا۔ اور ہزار روپے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بھائی جان لیجئے یہ روپے رکھ لیجئے۔"

میں نے روپے نہ لیے۔ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بیوی بھی موجود تھی۔ وہ بھی خاموش بیٹھی رہی

احمد نے نرم لہجے میں اصرار کیا "غصہ تھوک دیجیے۔" اس نے نوٹ ایک بار پھر میری طرف بڑھائے۔

اس دفعہ میں نے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تیکھے لہجے میں بولا "مجھے روپے دوپے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کو اپنے ہی پاس رکھو۔ ان روپوں کو لے کر مجھے اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا"۔

"اجی چھوڑیئے بھائی جان۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔" وہ ڈھیٹ بن کر مسکراتا رہا۔ "وقت دیکھئے اور اپنے حالات دیکھئے۔ آپ کو اپنی فکر نہیں مگر بھابی اور بچوں کو تو دیکھیے۔ نہ پہننے کو ہے نہ پیٹ بھر کھانے کو۔ اس طرح کب تک ایک ایک چیز کو ترستے رہیں گے۔ ان کی خستہ حالی دیکھ کر میرا تو دل تڑپ اٹھا"۔

"تمہاری اس ہمدردی کا بہت بہت شکریہ"۔ میں نے بے زاری سے کہا "یہ روپے اب تم اپنی جیب میں رکھ لو۔ اور کان کھول کر سن لو کہ میں ان کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

مگر اس کے رویّہ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ رقم دینے کا تہیہ کر کے آیا تھا۔ میری طرف سے مایوس ہو کر وہ اپنی بھاوج کی جانب متوجہ ہوا۔ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ روپے اس کی طرف بڑھائے۔

"بھائی جان تو اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں لیجیے بھابی، آپ ان کو رکھ لیجیے"۔

بیوی نے بھی روپے نہ لیے۔ لیکن احمد نے ہمت نہ ہاری۔ روپے اپنی بھابی کی گود میں ڈالے۔ مڑا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ میں نے ٹوکا "ٹھیر جاؤ احمد۔ میری بات تو سنو"۔ مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔

اس کے جانے کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ نہ میں نے کچھ کہا نہ بیوی نے۔ دونوں گم صم بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد بیوی نے سکوت توڑا، پوچھا "ان روپوں کا کیا کروں؟" اس نے نوٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

"فی الحال تو ان کو حفاظت سے رکھ دو۔ احمد جب آئے تو واپس کر دینا بلکہ اس کے آنے کا کیوں انتظار کیا جائے۔ میں دلبند خاں کو پہنچا دوں گا کہ احمد کو دے دے۔" میں نے اکتا کر کہا۔ "اب تم مجھے ایک پیالی چائے بنا کر پلا دو۔" اس نے نوٹ سنبھالے اور اٹھ کر چلی گئی۔

میں دلبند خاں کے پاس جانے کے بارے میں روز ارادہ کرتا لیکن دفتر کی مصروفیت میں ایسا

الجھا رہا کہ جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کئی دن گزر گئے۔ اسی اثناء میں چھوٹی بچی بیمار پڑ گئی۔ بیوی گھریلو علاج معالجہ کرتی رہی مگر افاقہ نہ ہوا۔ اسے ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہا تو دوا دارو کے لیے کچھ نہ تھا۔ بیوی سے کہا کہ پاس پڑوس سے کچھ روپے قرض لے لو۔

وہ بولی "پہلے ہی سب سے اتنا قرض ادھار لے رکھا ہے کہ اب تک ادا نہ کیا جا سکا۔ اب کس منہ سے کسی کے پاس جاؤں اور جاؤں گی بھی تو خالی ہاتھ لوٹنا پڑے گا۔"

میرے زور دینے پر وہ چلی گئی مگر جیسا اس نے کہا تھا۔ وہی ہوا۔ کہیں سے کچھ نہ ملا۔

میں سر جھکائے دل گرفتہ بیٹھا تھا۔ بیوی نے مجھے اس عالم میں دیکھا تو جھجکتے ہوئے کہا: "احمد جو روپے دے گیا تھا۔ وہ رکھے ہیں۔ اس میں سے سو روپے کہئے تو لے آؤں؟"

"نہیں۔ ان کو ہاتھ نہ لگانا۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ "کل صبح دفتر جاتے وقت یاد دلا دینا میں یہ روپے دلبند خان کو ضرور پہنچا دوں گا۔"

"مگر میں نے تو کچھ کم دو سو روپے اس میں سے خرچ بھی کر لیے۔"

میں نے جھلا کر اسے ڈانٹا "تم نے میرے منع کرنے کے باوجود ان کو کیوں خرچ کیا؟"

"نہ کرتی تو کیا کرتی۔ گھر میں فاقہ پڑ جاتا۔" اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ "پڑوس کے کرامت صاحب کی بیوی نے الگ جان کھا رکھی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کئی مہینے پہلے ان سے سو روپے ادھار لیے تھے۔ اب تک ادا نہیں کیئے تھے۔ پچھلے جمعہ کو آنکھیں نکال کر ایسی کھڑی ہو گئیں کہ ان کے روپے نہ دیتی تو وہ ایسا ہنگامہ برپا کرتیں کہ پاس پڑوس میں تھڑی تھڑی ہوتی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر بیوی کی آواز ابھری "بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟" اس نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا "میں سو روپے کا ایک نوٹ نکالے لیتی ہوں۔ آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔"

"نہیں۔ میں ان میں سے کچھ نہیں لوں گا۔" میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

"چاہے بچی کی جان چلی جائے مگر آپ کی آن نہ جائے"۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھی"۔ ایسی ہی آن ہے تو پھر یہ فلیٹ بھی چھوڑ دیجیے۔ یہ بھی تو بختاور کا ہے"۔

میں تلملا کر رہ گیا مگر کچھ کہتے بن نہ پڑی۔ کہتا بھی کیا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ میں سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔ بیوی اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ دبا تھا۔ نوٹ میری طرف بڑھا کر اس نے نرم لہجے میں کہا"خواہ مخواہ خود کو ہلکان نہ کیجئے۔ یہ نوٹ لیجئے اور فوراً بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جایئے۔ ذرا اس کی حالت تو دیکھیے کیا ہو رہی ہے۔ کیسی اکھڑی اکھڑی سانس بھر رہی ہے۔ یا اللہ! میری بچی کو بچا لے"۔ اس کی آواز بھر اگئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے خاموشی سے نوٹ لیا۔ بچی کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ فوراً انجکشن لگایا۔ بچی کو واپس گھر لایا۔ رات کو اس کی حالت اور غیر ہو گئی۔ اب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ممکن نہ تھا۔ آدھی رات کو ڈاکٹر کے گھر پر پہنچا۔ بیوی کا خدشہ درست نکلا۔ ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ ماں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔

اس آڑے وقت میں احمد کے دیئے ہوئے روپے بہت کام آئے ورنہ بچی کی تجہیز و تکفین کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتے۔ اپنا عالم تو یہ تھا کہ زہر کھانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ بیوی کے پاس جو ٹوم چھلا تھا۔ وہ پہلے ہی بک چکا تھا۔

اب صورت احوال یہ ہے کہ احمد ہر مہینے چمکتی دمکتی کار پر آتا ہے اور پابندی سے ہزار روپے دے جاتا ہے۔ کبھی تاخیر ہو جاتی ہے تو بے چینی سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ اس کی کیمیاگری نے میرے دن پھیر دیئے ہیں۔ اچھا کھاتا ہوں۔ اچھا پہنتا ہوں۔ عزت بھی ہے۔ خوش حالی بھی ہے غرضیکہ بڑے آرام سے گزر بسر ہوتی ہے۔ غربت و افلاس کے بادل چھٹ چکے ہیں۔ مسرت و شادمانی کی دھوپ نکل آئی ہے۔ بقول شخصے۔ اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

خداداد کالونی

اس ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں، دونوں بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ہر طرف کہر کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ اندھیرے میں وہ بھوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ بالم نے اکتا کر انگڑائی لی اور آہستہ سے بولا "چل یار۔ اب تو نیند معلوم ہو رہی ہے" غازی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اسی وقت سامنے درختوں کے نیچے کتوں کے بھونکنے کی آواز ابھری۔ اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا "شی! کوئی آرہا ہے" سنسان سڑک پر قدموں کی آہٹ صاف سنائی پڑ رہی تھی۔

کوئی اسی طرف آرہا تھا۔ غازی نے جھٹ شلوار کے نیفے سے چاقو نکالا اور بالم کی کمر میں کہنی مار کر بولا "لے بے کام بن گیا"

دونوں اندھیرے میں دبے دبے قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر اندھیرے میں ایک دھندلا سا انسانی سایہ نظر آیا اور جیسے ہی وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے سامنے پہنچا۔ دونوں لپک کر شکاری کتے کی طرح اس کے سر پر جا پہنچے۔

بالم نے ڈپٹ کر کہا "ٹھہر جا"

غازی نے جھپاک سے چاقو اس کے سینہ پر رکھ دیا "سالے! ذرا بھی آواز نکلی تو پورا چاقو اتار دوں گا"

نووارد لمحہ بھر تو ہکّا بکّا کھڑا رہا کہ یہ کیا مصیبت نازل ہوئی۔ پھر اس نے بڑی بے نیازی سے کہا: "اماں! یہ چاقو تو سامنے سے ہٹاؤ۔ تم تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مار ہی دو گے مطلب کی بات کہو۔ چاہتے کیا ہو؟" اس کے لہجہ میں ذرا بھی گھبراہٹ نہ تھی۔

اس دیدہ دلیری پر دونوں نے اسے ایسی حیرت سے دیکھا کہ چاقو پر غازی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ گم صم کھڑے اس پستہ قد آدمی کے چہرے کو تک رہے تھے جو کانوں پر گلوبند لپیٹے سردی سے سکڑا سکڑا یا کھڑا تھا۔

بالم نے اپنی بھاری آواز سے ایک بار پھر اس کو ڈانٹا: "ابے کہنا دہنا کیا ہے، جو کچھ ہے نکال کر سامنے رکھ دے۔" فوراً ہی غازی نے چاقو پھر اس کے سینہ پہ رکھ دیا مگر وہ ایسا ڈھاکڑ تھا کہ اس دفعہ بھی مرعوب نہ ہوا۔

"اماں پھر تم نے چاقو سامنے رکھ دیا۔" اس نے بغیر کسی جھجک کے غازی کا ہاتھ ہوئے سے ایک طرف کر دیا کہنے لگا: "بابا، اتنا ناراض کیوں ہوتے ہو یہ لو۔" اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ باہر نکالا اور دونوں کے سامنے کر دیا۔ "لو سنبھالو! پورے بارہ آنے کی ریزگاری ہے، البتہ اس میں ایک دونی کھوٹی ہے۔ بعد میں مجھ کو گالیاں نہ دینا۔ یہ رہا بیڑی کا بنڈل۔ ماچس بھی ساتھ میں ہے کہو تو کوٹ بھی اتار دوں۔ اس کو نہ لو تو اچھا ہے۔ ابھی مجھ کو کئی میل جانا ہے۔ سردی میں اکڑ کر رہ جاؤں گا۔"

اس کی باتیں سن کر دونوں بڑے چکرائے۔ غازی نے ریزگاری اور بیڑی کا بنڈل لینے کو تو لے لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ واپس کر دے یا رکھ لے۔ کم از کم اس وقت کے چائے پانی کا خرچہ تو نکل ہی آتا۔ بالم نے بھی زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ جیبوں کی تلاشی سے جب کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو وہ اس کے پائجامہ کا نیفہ ٹٹولنے لگا۔ راہگیر اس کا مقصد بھانپ گیا تھا مسکرا کر بولا: "نہیں جی تم میری پوری ننگا جھوری لے لو۔ میں پائجامہ اتارے دیتا ہوں۔ اچھی طرح دیکھ لو۔" اتنا کہہ کر وہ ازار بند کھولنے لگا۔

غازی اس کی اس تیزی پر جل کر چیخا: "نہیں بے، اس کی ضرورت نہیں۔ سالے زیادہ تیزی دکھائی تو لگاؤں گا دو ہاتھ۔" کہنے کو تو اس نے اکڑ فوں میں یہ بات کہہ دی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ آج بڑے بکٹ سے پالا پڑا ہے۔

بالکل یہی بات بالم نے بھی سوچی مگر اس نے خود پر زبردستی غصہ طاری کیا۔ اس شخص کی کمر پر کس کے ایک لات ماری چیخ کر بولا: "سیدھا ناک کی سیدھ میں چلا جا۔ مڑ کر دیکھا تو سمجھ لینا سالے خاں تمہاری خیریت نہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ دونوں خاموش کھڑے اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر غازی کو کچھ خیال آیا۔ اونچی آواز سے اسے ٹوکا: "ابے ٹھہر جا۔" اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ بالم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ غازی نے قریب جا کر تمام ریزگاری اور بیڑی کا بنڈل اس کے ہاتھ میں دے دیا: "لے بھئی لے، یہ رہی تیری رقم۔" اس دفعہ اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ نہ اس میں تلخی تھی نہ ڈانٹ پھٹکار۔

وہ شخص کہنے لگا: "نہیں جی، تم مجھ کو صرف ایک دوّنی دے دو ناکہ ایک کپ چائے پی لوں۔ ہو سکے تو ایک بیڑی بھی سلگا کر دے دو۔"

غازی اب اس پر مہربان ہو چکا تھا۔ ہنس کر بولا: "اب تم اس کو رکھ لو۔ چائے ہم تم کو پلائیں گے اور بیڑی کے بجائے یہ لو سگریٹ پیو۔" اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، کھولا۔ سگریٹ نکال کر سلگائی اور اس کے ہاتھ کی طرف بڑھائی۔ "یار، تیرا نام کیا ہے؟"

"یار محمد۔" اس نے بتایا "مگر سب مجھے ٹینی کہتے ہیں۔"

بالم نے ہنس کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا: "اماں، الگ ہی الگ خاطر داریاں کرتے رہو گے۔ ادھر بھی تو ایک سگریٹ بڑھاؤ۔"

غازی نے سگریٹ نکالی اور بالم کو دے دی۔ وہ سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔

تینوں سڑک پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تین ہٹی کے چوراہے پر ایک چائے خانہ میں انھوں نے

چائے پی۔ جب وہ باہر آئے تو ایک بج رہا تھا۔ غازی کو ٹمینی نے کچھ ایسا متاثر کیا کہ معاً خیال آیا کہ آدمی تو اپنے کیبنڈے کا لگتا ہے۔ اگر ساتھ میں آ جائے تو اچھا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔

"اماں اس جاڑے پالے میں کہاں جاؤ گے؟" غازی نے چلتے چلتے اس سے کہا: "اپنے ہی ساتھ ٹھہر جاؤ۔ اب رات رہ ہی کتنی گئی ہے۔ نیند نہیں آئے گی تو چائے کا ایک دور اور چلے گا۔ یہاں تو رات بھر ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔"

ذرا سی حیل و حجت کے بعد وہ ان کے ساتھ ٹھہرنے پر رضا مند ہو گیا۔

تینوں ایک کیبن کے نزدیک پہنچ کر رک گئے۔ کیبن لکڑی کا بنا ہوا تھا اور فٹ پاتھ سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا۔ عقب میں ایک سرکاری کوارٹر کی دیوار تھی۔ قریب ہی نیم کا گھنا درخت تھا۔ جس کی شاخیں کیبن پر جھکی ہوئی تھیں۔

بالم بولا: "لو بھئی اپنا ٹھیا آ گیا۔" اس نے جھک کر کیبن کے نیچے دیکھا، پھر غازی سے پوچھنے لگا: "موم بتی جلا دوں؟"

"جلا لو تو اچھا ہے۔" غازی نے جواب دیا۔

بالم کیبن کے نیچے گھس گیا۔ اسی وقت اندر سے ایک کتیا نکل کر تیزی سے بھاگی اور ذرا دور ہٹ کر زور زور سے بھونکنے لگی۔ اندر سے بالم کی آواز سنائی دی: "لو یار اپنا تو پلیتھن ہو گیا۔ اس حرام زادی نے تو یہاں بستر میں بچے جنے ہیں۔" ساتھ ہی اندر سے پلّوں کے پیاؤں پیاؤں کرنے کی آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔

غازی گھبرا کر بولا: "مار دیا حرام کی جنی نے۔ جب ہی تو میں کہوں کہ یہ سالی آج اس طرح کیوں بھونک رہی ہے!"

بالم وہیں سے بولا: "ان سالوں کو بستر سے نکال کے کہاں ڈالوں؟"

غازی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ادھر کتیا تھی کہ برابر بھونکے جا رہی تھی۔ وہ مخمصہ میں

پڑ گیا۔ کہنے لگا۔" ان کو نکالو گے تو سارے سردی میں مر جائیں گے اور یہ سالی کب سونے دے گی۔ اس حرام زادی نے تو خاصی مصیبت کھڑی کر دی۔" جھنجلا کر وہ جھپٹا اور کتیا کے منہ پہ زور سے لات ماری۔ وہ ٹیں ٹیں کرتی دور چلی گئی مگر ذرا دیر بعد پھر قریب آ کر بھونکنے لگی۔ بالم دکان کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ دونوں بے حد پریشان معلوم ہو رہے تھے۔

"بھئی اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟" ٹینی نے ان کی پریشانی کو تاڑ لیا۔ کہنے لگا۔" چلو میرے ساتھ۔ کسی نہ کسی طرح رات کاٹ لیں گے۔"

دونوں کو اور کیا چاہیئے تھا۔ فوراً آمادہ ہو گئے۔ غازی نے جوش میں آ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔" یار ٹینی تو واقعی بڑے کام کا آدمی ہے۔ ورنہ اس حرام زادی نے تو آج رات مار ہی دیا تھا۔"

تینوں وہاں زیادہ دیر نہ ٹھیرے۔ آگے بڑھے اور خداداد کالونی کی طرف چل دیئے، جہاں ٹینی رہتا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹہ بعد تینوں خداداد کالونی پہنچ گئے۔ غازی کو علاقہ بہت پسند آیا۔ سڑک کے ایک جانب شاندار کوٹھیاں تھیں۔ دوسری طرف طرح طرح کی جھگیاں اور جھونپڑیاں تھیں۔ جو دور تک بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ جھگیوں کے درمیان ایک اونچے ٹیلے پر قائداعظم کا مزار تھا۔ جس پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کرنے کا منصوبہ زیرِ غور تھا۔

کوٹھیوں میں کہیں کہیں اب تک روشنی ہو رہی تھی۔ جھگیوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔

ٹینی کا گھر کوٹھیوں سے متصل تھا۔ یہ بھی ایک بڑی کوٹھی ہی تھی مگر اس کی تعمیر نامکمل رہ گئی تھی۔ اس کا مالک کوئی ہندو سیٹھ تھا جو ہندوستان چلا گیا تھا۔ عمارت اب متروکہ جائداد قرار دی جا چکی تھی۔ اس وقت اس میں کئی مہاجر خاندان آباد تھے۔ جنہوں نے کمروں اور دالانوں کے علاوہ کوٹھی کے احاطے

میں بھی چٹائی اور پھوس کی جھگیاں کھڑی کر کے سر چھپانے کا ٹھکانہ پیدا کر لیا تھا لیکن ٹینی کے پاس پورا ایک کمرہ تھا۔ اوپر چھت تھی۔ فرش بھی پختہ تھا البتہ دیواروں پر پلاستر نہیں ہو سکا تھا۔ دروازہ خود اس نے اپنے خرچ سے لگوایا تھا۔

ٹینی نے کمرے کے اندر جا کر لالٹین روشن کی۔ غازی اور بالم نے بڑی حیرت سے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں ایک طرف چارپائی پڑی تھی۔ قریب ہی پانی سے بھرا ہوا گھڑا اور کچھ برتن موجود تھے۔ سامنے دیوار پر لکڑی کا تختہ لگا تھا جس پر ایک چوکور آئینہ، تیل کی شیشی اور کنگھا رکھا تھا۔ غازی نے کمرے میں چل پھر کر ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لیا۔ بستر کے سرہانے پڑی ہوئی فلمی گانوں کی کتاب اٹھائی اور لالٹین کی روشنی میں نظریں گڑو گڑو کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب وہ پڑھ نہ سکا تو ٹینی کے سامنے کتاب ڈال کر گویا ہوا۔

"ابے تو تو جان پڑتا ہے کہ پڑھ لکھ بھی لیتا ہے۔"

ٹینی انکساری برتنے کے سے انداز میں بولا "نہیں جی، بس یونہی کچھ اٹکل پچو سے کام نکال لیتا ہوں۔"

غازی نے مڑ کر بالم کی جانب دیکھا، مسکرا کر پوچھا "کیوں بے کیا خیال ہے؟" اس نے قدرے تامل کیا "یار مجھے تو یہ مکان بڑے ٹھاٹھ کا لگا۔"

وہ بولا "ہاں جی بڑا اچھا مکان اس کے ہاتھ لگ گیا۔"

ٹینی اکڑ کر بولا "یوں ہی نہیں ملا۔ پورے تین سو روپے پگڑی دے کر قبضہ ملا ہے۔"

غازی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا "کیوں نہیں۔ اس سے کم میں کیا ملا ہو گا۔ پھر جگہ بھی موقع کی ہے۔ ایک ہی دفعہ کام بن جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔"

بالم نے بھی اس کی تائید کی "ایک سے ایک بڑھیا کوٹھی ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی موٹی مرغی پڑی ہے۔"

ٹینی جو اپنے گھر کی تعریف سن کر خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا تھا، ان باتوں کو سن کر بہت سٹ پٹایا۔ اس نے فوراً ان کو ٹوکا۔ "دیکھو جی یہ اپنا دھندا تم اپنے ہی علاقے میں کرنا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا "میں ایسی

یاری نہیں پالتا۔ رات یہاں بسر کر لو اور سیدھے سیدھے اپنے گھر کا راستہ لو۔"

بالم کو اس کی یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔"ابے اتنا اکڑتا کیوں ہے۔ چلے نہیں جائیں گے تو کیا یہیں ڈیرے ڈالے پڑے رہیں گے۔ تجھ کو زیادہ کھل رہے ہیں تو لے ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے دروازے کی سمت بڑھا۔

ٹینی دھیما پڑ گیا۔ منانے کے سے انداز میں کہنے لگا۔"یار تو نے حد کر دی۔ میرا یہ مطلب کب تھا۔ چل بیٹھ اس جاڑے پالے میں کہاں جائے گا۔"

غازی نے بھی سوچا کہ اب اس گرم گرم کمرے سے نکل کر باہر سردی میں جانا خاصہ کٹھن مرحلہ ہے۔ کہنے لگا۔"یار بالم تو بڑا اتیز ہے۔ سالا ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ تو نے بھی کس کی بات کا برا مانا۔ ارے یہ ٹینی تو اب اپنا یار ہو گیا ہے۔ میں نے تو سوچا ہے کہ اس کو بھی ٹولی میں شامل کر لیا جائے۔ آدمی کام کا ہے۔ ذرا اناڑی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ جس دن داؤ لگ گیا اور کرارے کرارے نوٹ سامنے آئے سب بھول جائے گا۔" اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔

بالم روٹھا ہوا سا بیٹھ گیا۔ ٹینی ذرا خاموش رہا پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔"تم دونوں ابھی لونڈے ہو۔ میں تم سے بہت پہلے سارے پاپڑ بیل چکا ہوں۔ چوری بھی کی، چاقو بھی چلائے۔ جیل بھی کاٹی۔ سارے جتن کر چکا ہوں۔ مگر بھائی خدا ان پولیس والوں سے بچائے۔ موت کے فرشتہ کی طرح ایک بار گھر دیکھ لیا تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کہیں واردات ہوئی خواہ مخواہ پکڑ بلوایا۔ کسی کے یہاں ڈنگا فساد ہوا۔ نزلہ سب سے پہلے ادھر گرا۔ اسی لیے گھر بار چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ بابا اب اپنے بس بوتا نہیں ہے۔ جس دن کھوکھرا پار کی سرحد میں داخل ہوا۔ اسی دن توبہ کر لی تھی کہ اب یہ کام نہیں کروں گا۔ اب تک اللہ میاں کا کرم ہے کہ اپنی بات پر قائم ہوں۔ تھوڑی بہت جو باقی ہے۔ اسی طرح عزت کے ساتھ گزر جائے تو اس کا لاکھ لاکھ شکر!"

دونوں خاموشی سے بیٹھے اس کی باتیں سنتے رہے۔

ذرا دیر کمرے کے اندر خاموشی رہی۔ پھر غازی کی آواز ابھری۔"پر یار کریں تو کیا۔ لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں یہاں اللہ کا نام ہے۔ نہ کوئی ہنر آتا ہے، نہ دست کاری۔ کام کاج کہیں ملتا نہیں۔ چھوٹا موٹا دھندا

کریں تو اس کے لیے رقم کہاں سے لائیں۔"

ٹینی کو جیسے پہلے ہی سے علم تھا کہ وہ یہی کہیں گے۔ وہ بڑے اطمینان سے ان کو سمجھانے لگا۔ "کوشش کرو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کہیں محنت مزدوری کرو۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تم پولس کے ہتھے نہیں چڑھے۔" اس نے دونوں کے چہروں کو نظر بھر کر دیکھا "یارو، غور تو کرو، بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ ہر وقت جان سولی پہ۔ کہیں پولس والا نظر آگیا، خون خشک ہو گیا۔ خواہ مخواہ ان کی خوشامد کرو اور گالیاں گھاتے ہیں کھاؤ۔ بھئی میں تو تمھارے ہی بھلی کی کہتا ہوں۔"

بالم ابھی تک چپ تھا۔ البتہ غازی اس کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا۔ کہنے لگا: "اچھا جی، یوں ہی سہی۔ چلو تمہاری بات مانی۔ تم جیسا کہتے ہو، وہی کریں گے۔ ہم کو بھی یہ زندگی کب پسند ہے۔"

ٹینی نے خوش ہو کر بیڑی سلگائی۔ دونوں کا حوصلہ بڑھایا۔ دل جوئی کی اور زندگی کی اونچ نیچ دکھا کر لمبا سا لیکچر دے ڈالا۔

رات کے پچھلے پہر تک، تینوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ہر ایک نے دل کی بات صاف صاف کہہ ڈالی۔ غازی تو پہلے ہی ٹینی کا مرید ہو چکا تھا۔ بالم بھی رفتہ رفتہ اس کی باتوں پر ایمان لے آیا۔ اس عرصہ میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ خاصے گھل مل گئے تھے۔ طے یہ ہوا کہ تینوں اب اکٹھا رہیں گے۔ ٹینی معمول کے مطابق سویرے کام پر چلا جائے گا۔ اور وہ دونوں ویسٹ وہارف جائیں گے۔ وہاں جہازوں پر سے سامان اتارنے کے لئے قلیوں کی بھرتی ہونے والی تھی۔ کچھ عرصہ تینوں اسی طرح محنت مزدوری کریں گے۔ اس کے بعد جب ہر ایک کے پاس سو سو روپے اکٹھا ہو جائیں گے۔ تو مل جل کر کوئی کاروبار شروع کر دیں گے۔ یہ اسکیم تیار کرنے کے بعد ٹینی نے اٹھ کر فرش پر بستر بچھایا تینوں کسی نہ کسی طور اس میں دبک کر سو گئے۔

یار محمد عرف ٹینی منہ اندھیرے اٹھ بیٹھا۔ اس نے جلدی سے انگیٹھی سلگائی۔ چائے کا پانی چڑھایا

تھوڑی دیر میں دودھ والا بھی آگیا۔ پھیری والے سے اس نے تین بن بھی خرید لیے۔ جب وہ چائے تیار کر کے اٹھا تو دھوپ سامنے میدان میں پھیل چکی تھی۔ غازی اور بالم ابھی تک بے خبر سو رہے تھے۔ ٹینی نے بڑی مشکل سے ان کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ دونوں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ٹینی نے لوٹے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ منہ دھو کر آئے تو چائے کی پیالیوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کھانے کے لیئے بن بھی موجود تھے۔ دونوں کو کئی سال بعد پہلی بار صبح اٹھنے کی خوشی میسر ہوئی تھی۔

تینوں نے چسکیاں لے لے کر چائے پی۔ بن کھائے اور رات کے پروگرام کے مطابق اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

شام کو جب ٹینی پلاسٹک کے کارخانے سے واپس ہوا تو اس نے دیکھا، دونوں دروازے پر پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کام بنا نہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قلیوں کی بھرتی ہو رہی ہے، مگر ٹھیکیدار کا منشی پچاس پچاس روپے فی نفر رشوت مانگتا ہے۔

ٹینی نے ان کو بد دل نہ ہونے دیا۔ ڈھارس بندھائی۔ کہنے لگا "دل کیوں چھوٹا کرتے ہو جب محنت ہی کرنا ٹھیری تو بندرگاہ پر نہ سہی کہیں اور سہی۔ ڈھونڈو تو خدا مل جاتا ہے۔ کام کا ملنا کونسی مشکل بات ہے۔"

اس کی باتوں سے دونوں خاصے پر امید ہو گئے۔ دوسرے دن تینوں پھر گھر سے نکل کر اپنی اپنی سمتوں کو چل دیئے۔ اس روز بھی دونوں ناکام لوٹے۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے پاس جو دو چار روپے موجود تھے، بھاگ دوڑ میں خرچ ہو چکے تھے۔ ٹینی کو جلد ہی ان کے قلاش ہونے کا پتہ چل گیا۔ وہ ان کی اور بھی زیادہ ناز برداری کرنے لگا کہ کہیں دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔ صبح اٹھ کر وہ اسی طرح ان کو چائے پلاتا۔ رات کو تینوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ وہ ان سے بے تکلفی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا مگر وہ ان سے جس قدر بے تکلف ہونا چاہتا تھا۔ وہ اسی قدر بیگانے سے ہوتے جا رہے تھے۔ اب وہ اس کو ٹینی کے بجائے اس کے اصلی نام یار محمد سے مخاطب کرتے۔ خواہ مخواہ خوشامد کرنے کی کوشش کرتے۔ اس معاملہ میں غیر ارادی طور پر ان دونوں میں ایک مقابلہ شروع ہو گیا تھا کہ کون ٹینی کی

زیادہ خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ اب دن چڑھے تک سونے کے بجائے وہ صبح تڑکے ہی اٹھ کر انگیٹھی سلگا دیتے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ٹینی کے سو کر اٹھنے سے پہلے ہی چائے تیار ہو جاتی۔

ٹینی کے ساتھ رہتے ہوئے مشکل سے دو ہفتے گزرے تھے، مگر اس مختصر مدت میں دونوں خاصے بدل گئے تھے۔ اس بات پر خود ٹینی کو بھی تعجب تھا۔ اب اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح دونوں کام دھندے سے لگ جائیں۔ آخر ایک روز ایسی امید بھی نظر آئی۔ اس کے ایک ملنے والے نے صابن کے ایک کارخانے میں دونوں کے لیے کام کی سبیل نکالی تھی۔ اس شام وہ بڑا خوش خوش گھر پہنچا۔ ابھی تک دونوں واپس نہیں آئے تھے۔ وہ ان کی واپسی کا بے چینی سے انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں اس کی نظر بستر پر گئی دیکھا رضائی غائب تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب جو اس نے دوسرے سامان کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ لوٹا بھی غائب تھا۔ اس بات سے اس کو بے حد صدمہ پہنچا۔

وہ رات اس کے لیے کاٹنا دوبھر ہو گئی۔ سردی بھی زیادہ تھی۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس نے انگیٹھی سلگا لی اور اس پر ہاتھ پھیلا کر جسم میں گرمی پہنچاتا رہا۔ جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں تو انگیٹھی کے پاس ہی کنڈلی مار کر پڑ جاتا مگر ذرا ہی دیر بعد آنکھ کھل جاتی پھر کوئلے دہکاتا۔ نیند پھر حملہ کرتی۔ ساری رات وہ جاگتا رہا اور بے قراری سے دونوں کا انتظار کرتا رہا۔ نہ وہ واپس آئے اور نہ ہی وہ گھڑی بھر اطمینان سے سو سکا۔

صبح جب وہ کام پر گیا تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کام کرتے کرتے نیند کا جھونکا آ جاتا۔ کئی بار وہ گرتے گرتے بچا۔ اس روز اس نے جی بھر کے دونوں کو گالیاں دیں۔ گھر لوٹتے ہوئے اس نے بازار سے پٹ سن کی خالی بوریاں خریدیں، اور رات گئے تک ان کو جوڑ جوڑ کر سیتا رہا۔ ان سے رضائی کی سی گرمی اور آرام تو نہیں ملا مگر نیند آ گئی۔

کئی روز گزر گئے۔ رات تاریک اور سرد تھی ٹینی ٹاٹ کے سلے ہوئے ٹکڑے کے اندر دبکا ہوا پڑا تھا کوئی ۱۱ بجے کا عمل تھا۔ ساری آبادی سنسان پڑی تھی۔ اچانک رات کے سناٹے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ٹینی نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ غازی اور بالم مجرموں کی طرح گردن جھکائے سامنے کھڑے تھے۔ ایک کی بغل میں نئی رضائی دبی ہوئی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں جھلکتا ہوا لوٹا لٹک رہا تھا۔

ٹینی نے تیوری پر بل ڈال کر دونوں کو دیکھا۔ ہاتھ جوڑ کر تیکھے لہجے میں بولا "بس بھیّا اب تو تم مجھ کو بخش ہی دو اور یہ دونوں چیزیں بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔

غازی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ پیر سے جوتا نکال کر ٹینی کے سامنے ڈال دیا۔

"سو جوتے مار لو ٹینی بھیّا، مگر اپنی زبان سے یہ بات نہ کہو"۔

بالم، جواب تک خاموش کھڑا تھا، روہانسا سا ہو کر بولا "اب ہم تو یہ طے کر کے آئے ہیں کہ یہ ساتھ چھوٹے گا تو بس مر کر ہی چھوٹے گا"۔ اتنا کہہ کر وہ اس کے پیروں پر جھک گیا۔

ٹینی کا غصّہ پہلے ہی کافور ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے بالم کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا۔ تڑپ کر بولا "یار بالم کیا غضب کر رہا ہے۔ تو تو میرا بھائی ہے"۔ اس نے کھینچ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ بالم اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچّوں کی طرح رونے لگا۔

تینوں کمرے کے اندر آ گئے۔ غازی نے سب سے پہلے یہ خوشخبری سنائی کہ اسے ایک ہوٹل میں کام مل گیا تھا۔ بالم بھی رکشہ چلانے کے دھندے سے لگ گیا تھا۔ ٹینی کو نئی رضائی اور نئے لوٹے کے ملنے سے زیادہ یہ بات سن کر خوشی ہوئی۔

تینوں پچھلے دنوں کی طرح ایک بار پھر بے تکلفی سے گالیاں بک بک کر باتیں کر رہے تھے۔ دفعتاً غازی نے مڑ کر بالم کو دیکھا، پوچھا "ابے بالم، وہ ڈبہ کہاں ہے؟"

بالم نے جھٹ جواب دیا "لے یار میں تو بالکل بھول ہی گیا تھا"۔

اس نے نٹ کھٹ چھوکرے کی طرح چھلانگ لگائی۔ رضائی کی تہہ کھولی۔ اندر سے ایک ڈبہ نکالا

اور اسے کھول کر ٹینی کے سامنے رکھ دیا۔ ڈبہ کے اندر حلوہ اور پراٹھے تھے۔ تینوں نے مزا لے لے کر کھائے اور رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ٹینی بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ غازی اور بالم کے چلے جانے سے کمرے میں جو ویرانی برسنے لگی تھی، آج کئی روز بعد زائل ہو چکی تھی۔

سویرے اٹھ کر انہوں نے مل جل کر بڑی مستعدی سے چائے تیار کی اور خوشی خوشی اپنے کاموں پر چل دیئے۔ کئی روز تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ٹینی کو جیسے یقین ہو چلا تھا کہ اب تینوں مل کر تین سو روپے جلد ہی مہیا کر لیں گے اور پھر کاروبار کرنے کی اسکیم پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

انھی دنوں ایک روز خلاف توقع غازی جلد ہی واپس آگیا۔ وہ عام طور پر ۱۱ بجے رات تک ہوٹل کا کام نبٹا کر آتا تھا۔ ٹینی نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔

"اماں! تم آج جلدی کیوں چلے آئے؟"

غازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ سلگتی ہوئی انگیٹھی کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ دہکتے ہوئے کوئلوں کی سرخ سرخ آہنچ میں اس کا چہرہ پتھر کے مجسمہ کی طرح ٹھوس نظر آ رہا تھا۔ ٹینی نے اس دفعہ اصرار کر کے دریافت کیا۔

"یار کچھ بتا تو سہی، آخر ہوا کیا؟"

غازی نے اس طرح نظریں اٹھا کر دیکھا جیسے دکھ سے ابھی رو دے گا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا "یار ٹینی، میں نے نوکری چھوڑ دی۔"

اڑا اڑا دھم، ٹینی کو ایسا محسوس ہوا گویا مکان کی چھت اس پر آ گری۔ گھبرا کر بولا "کیوں؟ بات آخر کیا ہوئی۔"

غازی کہنے لگا "بات کیا ہوتی۔ میں کام ختم کر کے لوٹ رہا تھا کہ نمبر ۱۲ کے مسافر نے مجھ کو آواز دی۔ میں اندر چلا گیا۔ وہ آج ہی دوپہر کو اس کمرے میں آیا تھا۔ سالے کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی ہوں گی۔ مجھ سے چھوٹتے ہی کہتا کیا ہے کہ کوئی لونڈیا لے کر آؤ۔ تم کو بھی خوش کر دوں گا۔ تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے کہا ابے تو نے مجھ کو کوئی بھڑوا سمجھا ہے۔ سچ کہتا ہوں ٹینی بھائی چاقو نہیں تھا۔ نہیں تو سالے

کے ٹکڑے کر ڈالتا۔ خاصی تو تو میں میں ہوگئی۔ مینیجر بھی وہاں آگیا۔ وہ سالا الٹا مجھ پر گرجنے لگا۔"

ٹینی بیچ میں بول پڑا۔" تم نے مینیجر کو پوری بات سمجھائی ہوتی۔"

غازی بگڑ کر بولا۔" تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اس کو سارا واقعہ نہیں بتایا۔"

" تب تو یار بڑی زیادتی ہوئی۔"

وہ کہنے لگا۔" لو یار۔ اب ہم کمبیوں کی دلالی کریں گے۔ تف ہے سالی ایسی زندگی پر۔"

وہ دیر تک بیٹھا گالیاں بکتا رہا۔ ٹینی کبھی کبھار بیچ میں بول پڑتا۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے مگر بالم ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ دس بجے سے پہلے ہی پہلے واپس آجاتا تھا۔ دونوں اس کا انتظار کرتے کرتے لیٹ گئے۔ کوئی تین بجے کے قریب ٹینی کی آنکھ کھلی۔ اس نے غازی کو جگایا۔" اماں غازی یہ اپنا بالم ابھی تک نہیں لوٹا۔ خدا جانے کیا ہوا۔" اب تو غازی کو بھی تشویش ہوئی۔ دونوں کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ بیٹھے سوچتے رہے کہ اس وقت کیا کیا جائے۔

صبح کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ سردی شدید ہوگئی تھی۔ دونوں یہ طے کر کے باہر جانے ہی والے تھے کہ چل کر بالم کا پتہ لگایا جائے کہ اسی اثنا میں دروازہ کھول کر بالم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ مردے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

غازی نے پوچھا۔" اماں کہاں سے آرہے ہو؟"

وہ بولا۔" حوالات سے۔"

ٹینی نے گھبرا کر کہا۔" حوالات سے؟ آخر ہوا کیا؟"

وہ بتانے لگا۔" سالے نے موٹر الگ اوپر چڑھادی۔ پوری رکشا کا کچومر کر دیا۔ اور حوالات بھی دکھادی۔ ٹانگ کا الگ یہ حال ہوا۔" اس نے شلوار چڑھا کر پنڈلی دکھائی۔ اس پر کالا کالا خون جما ہوا تھا۔

ٹینی نے بڑے دکھ سے کہا۔" لو بھئی یہ بھی دھندے سے چھوٹا۔ دونوں پر ایک ہی روز مصیبت نازل ہونے والی تھی مگر اب کیا کیا جائے۔" پھر وہ کئی روز تک یہی بات سوچتا رہا۔ دونوں ایک بار پھر روزی کی تلاش میں سویرے ہی سویرے نکل جاتے اور شام کو منہ لٹکائے واپس آتے۔

دونوں کی تمام پونجی جلد ہی ختم ہونا شروع ہوگئی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں جھگڑ پڑتے۔ گالی گلوچ سے بڑھ کر، کبھی کبھی ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی۔ ایک دوسرے سے بیڑی تک چھپا کر پیتے کہ کہیں دوسرا مانگ نہ لے۔ تنہائی میں وہ ایک دوسرے کے خلاف ٹینی کے کان بھرتے۔ ان میں آئے دن کی بڑھتی ہوئی کمینگی اور خودغرضی سے ٹینی بے حد پریشان ہوگیا تھا۔

پچھلے کئی روز سے غازی اور بالم میں سخت ٹھنی ہوئی تھی۔ آپس میں بات چیت بھی بند تھی۔ دونوں سویرے ہی سویرے علیحدہ علیحدہ سمتوں کو کام دھندے کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ شام کو جب ٹینی لوٹا تو دونوں میں سے کسی کا پتہ نہیں تھا۔ رات گئے تک بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں اس کو کئی بار تشویش بھی پیدا ہوئی۔ اس نے گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ بھی لیا۔ ساری اشیا جوں کی توں موجود تھیں۔

آدھی رات سے کچھ ہی دیر پہلے دونوں ساتھ ساتھ لوٹے۔ ان کے چہرے خلاف توقع ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ آتے ہی بالم تو ٹینی کے پاؤں دبانے لگا اور غازی نے جھٹ بیڑی سلگا کر پیش کی۔ ٹینی ہنس کر بولا" آخر یہ آج اتنی خوشامد کیوں ہو رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔"

بالم دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ غازی سے مخاطب ہو کر بولا" میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یار محمد فوراً بھانپ جائے گا۔ اماں اس کے قبضہ میں ضرور کوئی موکل وکل ہے۔ جبھی تو دل کی بات پڑھ لیتا ہے۔"

غازی بھی مسکرانے لگا" اب تو یہ بھانپ ہی گیا ہے تو پھر چھپانا کیا۔ صاف، صاف بتا دے۔"

وہ بولا" نہیں یار تو ہی بتا۔"

دونوں ایک دوسرے سے اصرار کرنے لگے ٹینی گومگو کے عالم میں سوچتا رہا کہ یہ سالے نہ جانے آج کیا پروگرام بنا کے آئے ہیں آخر پریشان ہو کے پوچھا" اماں صاف صاف کہو بات کیا ہے؟"

غازی کہنے لگا" ٹینی بھائی، بات یہ ہے کہ آج ایک جگہ مرقع دیکھا ہے" وہ آگے کہتے ہوئے جھجکنے لگا۔

بالم نے فوراً غازی کو سہارا دیا" خدا قسم آج وارے نیارے ہو جائیں گے بس تم اجازت دے دو۔"

ٹینی کی تیوری پر بل پڑ گئے مگر غازی نے اسے کچھ کہنے ہی نہ دیا. جھٹ بول اٹھا "صرف ایک دفعہ اجازت دے دو. آئندہ یہ کام ہو تو کرنے والے کی ۔" اس نے بھڑ سے ایک زناٹے کی گالی بکی. بالم نے ٹینی کے پاؤں اور بھی تیزی سے دبانے شروع کر دیے. غازی نے جلدی سے دوسری بیڑی سلگا کر پیش کی ۔

ٹینی سخت الجھن میں پڑ گیا. ناراض بھی ہوا سمجھایا بجھایا بھی مگر ان کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی کہ آج کے بعد کبھی چوری کریں تو جوتے مار کے گھر سے نکال دینا. پولیس کے حوالے کر دینا. کبھی دونوں کی صورت نہ دیکھنا. آخر ان کی ضد کے سامنے اسے مجبور ہونا پڑا ۔

ٹینی کی رضامندی ملتے ہی غازی نے جھٹ ٹرنک کے اندر سے چاقو نکالا. فرش پر رگڑ کر اس کی دھار تیز کی اور پوری طرح تیار ہو کر بالم کے ہمراہ باہر نکل گیا. ٹینی نے غور کیا. اس وقت دونوں بے حد خوش نظر آرہے تھے. ان کے چہروں پر خوف کا کہیں نام و نشان نہ تھا. ان کے جانے کے بعد باہر آہٹ بھی ہوتی تو وہ چونک پڑتا. ایسا محسوس ہوتا جیسے چاروں طرف خطرہ منڈلا رہا ہے ۔

مگر غازی اور بالم خطرے سے بالکل بے نیاز تھے. ایک گلی کے موڑ سے نکل کر سڑک پر آئے. دونوں نے موقع کی تلاش میں سڑک کا ایک چکر لگایا. تھوڑی دیر بعد وہ کوٹھیوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک اندھیری گلی میں مڑ گئے. اب وہ ایک عالی شان دو منزلہ مکان کے پچھواڑے کھڑے تھے. ہر طرف گہرا سناٹا تھا. کہر کے دھندلکوں نے تاریکی کا جال پھیلا رکھا تھا. بجلی کے کھمبے پر جلنے والا بلب روشنی کا مٹیالا دھبہ معلوم ہو رہا تھا ۔

ذرا دیر تک وہ کوٹھی کی چار دیواری کی اوٹ میں کھڑے آہٹ لیتے رہے. پھر غازی نے کوئی دعا پڑھ کر دونوں کندھوں پر دم کی اور "یا علی مدد" کہہ کر بلی کی طرح قد آدم دیوار پر چڑھ گیا. چوکنا نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا. آہستہ سے نیچے اترا اور کوٹھی کے احاطہ میں پہنچ گیا. بالم بھی دیوار پھاند کر ذرا ہی دیر بعد اس کے پاس پہنچ گیا. ہر طرف خاموشی تھی. تاریکی تھی. گھنے درختوں کے سایوں نے تاریکی کو اور گہرا کر دیا تھا ۔

پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق غازی نے چاقو دانتوں میں دبایا۔ دونوں ہاتھوں سے پانی کے پائپ کو آہستہ آہستہ ہلا کر اطمینان کیا۔ ایکبار پھر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سنبھل سنبھل کر پائپ کے سہارے چڑھتا ہوا دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ بالم نہایت مستعدی سے نیچے کھڑا پہرہ دے رہا تھا کہ ذرا بھی کھٹکا ہو تو سیٹی بجا کر فوراً غازی کو خطرے کا سگنل دے۔

کوٹھی کے پورچ کے اوپر جو کھلی چھت تھی، غازی وہاں ذرا دیر جھکا ہوا کھڑا رہا۔ پھر اس کمرے کی طرف بڑھا جو مشرقی گوشہ میں تھا۔ اس کے عقب میں گلی تھی۔ غازی دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے قریب پہنچا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لی۔ کمرے میں قبرستان کا سا سناٹا تھا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ دوسرے دروازے بھی بند تھے۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں تاہم اس نے اندر پہنچنے کی سبیل نکال ہی لی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر پیر ٹکا کر ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ روشن دان کو آہستہ سے دھکا دیا۔ وہ کھل گیا۔ غازی اچھل کر روشن دان پر پہنچا۔ گردن اندر داخل کی اور بدن کو سمیٹ کر کسی نہ کسی طور روشن دان کے راستے کمرے میں اتر گیا لیکن اس کوشش میں اس کا ایک کندھا بری طرح چھل گیا۔ وہ کندھے کی تکلیف کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کوئی چیز شور کرتی ہوئی دھڑام سے گری۔ ساتھ ہی وہ بھی منہ کے بل فرش پر آ رہا۔

کمرے میں ننھا سا سبز بلب جل رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں غازی نے دیکھا کہ وہ گلدان رکھنے کے ایک اونچے سے اسٹول کے پاس پڑا تھا۔ اس کی داہنی ٹانگ اس کے ایک پائے سے الجھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگ باہر نکالی ہی تھی کہ اچانک کمرے میں سہمی ہوئی آواز ابھری: "کون ہے؟" غازی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پیڈسٹل لیمپ روشن ہو گیا۔ اس کی تیز روشنی ہر طرف پھیل گئی۔

سامنے مسہری پر ایک نوجوان اور خوبصورت عورت گردن اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی جانب گھور رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے برابر سے ایک مرد کا چہرہ ابھرا۔ وہ بھی پریشان اور سراسیمہ نظر آ رہا تھا۔ عورت کا چہرہ اور خوف زدہ ہو گیا۔ بدحواس ہو کر وہ چیخنے لگی: "چور، چور!" رات کے گہرے سناٹے میں اس کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ برابر لیٹے ہوئے مرد نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر

رکھ دیا اور ذرا اونچا ہوکر تکیہ کے سہارے بیٹھ گیا۔ غازی نے چاقو سنبھالا اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے فرار ہونے کے لئے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آگے بڑھا اور دروازے کی جانب لپکا۔ عین اس وقت باہر زینے پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی آہستہ آہستہ کھانستا ہوا ادھر ہی آرہا تھا۔ غازی کے قدم وہیں رک گئے۔

"معلوم ہوتا ہے۔ وہ بڈھا کھوسٹ جاگ گیا" مرد نے سرگوشی کی۔ اس کی آواز خوف سے کپکپا رہی تھی "جلدی سے لیمپ بجھا دو۔"

"ہاں، وہی ہے" عورت کے چہرے پر سراسیمگی طاری ہوگئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور بیڈ سوئچ دبا کر لیمپ بجھا دیا۔

کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ باہر چھت پر قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی اور رفتہ رفتہ قریب آتی جارہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر چاپ ختم ہوگئی۔ ذرا دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ غازی نے چاقو تان لیا اور دروازے کی سمت اس طور مڑ کر چوکس کھڑا ہوگیا کہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہو، فوراً حملہ کردے۔

باہر سے آواز آئی "کیا ہوا بیگم ڈر گئیں؟"

عورت کچھ نہ بولی مرد بھی خاموش رہا۔ دونوں خوف سے دم بخود تھے۔ غازی بھی ڈرا ہوا تھا۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔

باہر دروازے پر بھی خاموشی تھی۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا مگر یہ پر ہول سکوت زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ دروازے پر پھر آواز ابھری "بیگم، بیگم! میں نے تمہارے کمرے سے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ خیریت تو ہے؟" اس دفعہ اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

عورت ہنوز دم بخود پڑی رہی۔ غازی بھی سانس روکے کھڑا تھا۔ وہ فوراً تاڑ گیا کہ آنے والا، سامنے مسہری پر لیٹی ہوئی عورت کا شوہر تھا۔ اب صورت حال کچھ اور سنگین ہوگئی تھی۔ وہ چاقو سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑا تھا اور نگاہیں اٹھائے مسلسل دروازے کو تک رہا تھا۔

دروازے پر پھر آہٹ ابھری اور زیادہ زور سے ابھری۔ ساتھ ہی آواز بھی آئی " بھئی بیگم، تم تو بہت گہری نیند سوتی ہو۔ دروازہ تو کھولو۔" وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ رک رک کر دروازہ بھی کھٹکھٹاتا رہا۔

"کون ہے بھئی؟ کاہے کو شور مچا رکھا ہے"۔ عورت اب خاموش نہ رہ سکی۔ اٹھلا کر بے زاری سے بولی۔

غازی نے مڑ کر مسہری کی جانب چوکنا نظروں سے دیکھا۔ وہ سخت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ کمرے میں ٹھیرنا خطرناک تھا اور فرار ہونے کا بھی کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔

"میں ہوں علی اشرف "۔ دروازے پر کھڑے ہوئے شوہر نے اونچی آواز سے کہا۔ "بیگم، تم خیریت سے تو ہو؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں "۔ بیوی نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "مجھے سخت نیند آرہی ہے۔ پریشان نہ کیجئے۔ جائیے جا کر سو جائیے۔ آپ کو تو نیند ہی نہیں آتی میری نیند بھی حرام کردی ہے۔"

وہ نرم لہجہ میں بولا "اچھا اچھا۔ ناراض نہ ہو۔ میں جا رہا ہوں۔ تم اطمینان سے سو۔"

بیوی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش لیٹی رہی، مگر شوہر خاموش نہ رہا۔ "اکبر بھی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں واہی تباہی گھومتا پھرتا ہے۔ اسے تو رات کو بھی چین نہیں"۔ وہ بڑبڑاتا رہا مگر بیوی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دم سادھے پڑی رہی۔

باہر دروازے پر کھانسنے کی آواز ابھری۔ وہ الجھ الجھ کر کچھ دیر کھانستا رہا۔ پھر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کے ہانپنے کی آواز کمرے کے اندر صاف سنائی دے رہی تھی۔ جب ذرا قرار آیا تو آہستہ آہستہ چلتا ہوا لوٹ گیا۔ اس کی چاپ چھت پر ابھرتی رہی۔ دور ہوتی گئی۔

جب چاپ زینے پر پہنچ کر رات کی خاموشی میں ڈوب گئی تو غازی کے ہوش بھی بجا ہوئے۔ اب وہ ان دونوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی۔ چاقو ہاتھ میں دبائے ہوئے آگے بڑھا۔ مسہری کے قریب پہنچا۔ سبز بلب کی دھندلی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا۔ مرد سہما ہوا تکیہ کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کا بالائی دھڑ لحاف سے باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ سردی سے کپکپا رہا تھا۔ غازی کو اپنی جانب گھورتے دیکھ کر اس نے پوچھا "کیا چاہتے ہو؟"

غازی نڈر ہو کر بولا ” چاہنا واہنا کیا ہے۔ جو مال پانی ہے نکال کر ادھر دو۔“

” اکبر!“ عورت نے مرد کو مخاطب کیا۔” جو کچھ تمھارے پاس ہے۔ دے دلا کر اس سے پیچھا چھڑاؤ۔“ اس کے لہجہ میں سخت غم و غصہ تھا۔” نہ جانے یہ مصیبت کہاں سے نازل ہو گئی۔“

اکبر نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ مڑا اور تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ اس نے پرس نکالا اور غازی کے سامنے پھینک دیا۔ دھیرے سے بولا ” اس میں جو کچھ ہے لے لو اور یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔“

غازی نے چمڑے کا خوش نما بٹوہ اٹھا کر کھولا۔ رقم گنی کل ۶۳ روپلے تھے۔ سخت کوفت ہوئی۔ اس نے بٹوہ جیب میں رکھا اور اپنی جگہ پر جما ہوا کھڑا رہا۔

عورت کو اس کا رویّہ گراں گزرا۔ جھنجھلا کر بولی ” اب کھڑے کیوں ہو؟ جاؤ یہاں سے۔“

غازی موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ درشت لہجہ میں گویا ہوا ” میں اس طرح یہاں سے نہیں ٹلنے کا۔ کچھ اور نکالو۔ اس ۶۳ روپلی سے اپنا کام نہیں چلے گا۔ جلدی نکالو ورنہ“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عورت کا چہرہ غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ اس نے بھنّا کر کچھ کہنا چاہا مگر اکبر نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر غازی کی جانب دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ اب اس کے پاس اور کچھ نہیں۔ غازی نے اسے نظر انداز کیا۔ عورت کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے بال تکیہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں اس کا چہرہ کچھ اور دل آویز ہو گیا تھا۔ وہ برابر اسے گھور رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے حقارت آشکارہ تھی۔ غازی نے بھی اس کی نفرت کو محسوس کیا۔ تلملا کر سوچا۔ یہ سالی حرّافہ کس اطمینان سے اپنے دھگڑے کے پہلو میں لیٹی ہے۔ ذرا بھی خوف زدہ نہیں۔ اوپر سے رعب جھاڑ رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ اس سے بھی اینٹھنا چاہیئے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر قہر آلود نظروں سے عورت کو دیکھا۔ چاقو سنبھال کر آگے بڑھا۔ ڈپٹ کر آہستہ سے بولا ” نقد نہیں ہے تو کوئی زیور دیور نکالو۔ جلدی کرو۔“ اس نے کھلا ہوا چاقو عین اس کے سامنے کر دیا۔

عورت کا سارا غصّہ کافور ہو گیا۔ سراسیمہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگی۔ اکبر بد حواس ہو کر

لحاف سے باہر آگیا۔ اس کے جسم پر نام کو لباس نہ تھا خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ گڑگڑا کر بولا
"خدا کی قسم اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ زیور دیور بھی نہیں ہے۔" عورت نے جلدی جلدی گردن ہلا کر
اس کی تائید کی۔ "زیور تو نیچے کمرے میں رکھا ہے، مگر میں وہاں کیسے جاسکتی ہوں۔" اکبر نے عاجزی سے
دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور سہمی ہوئی نگاہوں سے غازی کی جانب دیکھنے لگا۔ غازی کو ننگا دھڑنگا اکبر اس
عالم میں بڑا مضحکہ خیز لگا۔ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ جل کر بولا۔ "سالا زنخا۔ دہت تیری کی۔" اس نے
بڑی سڑی ہوئی گالی دی۔ وہ گالی سن کر بھی خاموش رہا۔ عورت بھی دم بخود پڑی رہی۔ غازی نے اس
کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ مزید ڈرانے دھمکانے سے گریز کیا۔ مبادا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ لینے کے دینے
پڑ جائیں۔ وہ جھنجلایا ہوا مڑا۔ دروازے پر پہنچا۔ بولٹ کھولا۔ باہر نکلا اور چھت پر پہنچ گیا۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ کہر کا نیلگوں دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ غازی منڈیر کے پاس پہنچا۔ پائپ کو مضبوطی
سے پکڑا اور اس کے سہارے پھسلتا ہوا چھت سے نیچے اتر گیا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔
بالم کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ احاطہ میں ٹھیرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ فوراً چار دیواری پر چڑھا اور آہستہ
سے گلی میں اتر گیا۔ بالم وہاں بھی نہ تھا۔ اسے تشویش لاحق ہوئی۔ گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچا مگر بالم دور
دور تک نظر نہ آیا۔ اس نے کئی بار حلق سے اپنی مخصوص آواز نکالی مگر اس اشارے کا اسے کوئی جواب
نہ ملا۔

غازی نے چاقو بند کیا اور احتیاط سے نیفے میں اُڑس لیا۔ بالم کے نہ ملنے پر وہ پریشان ہو
گیا تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں واپس ٹیکسی کے پاس پہنچا۔ دیکھا، بالم وہاں موجود تھا مگر خوفزدہ اور
گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔

غازی نے خفا ہو کر کہا۔ "سالے خاں، تم یہاں بیٹھے ہو اور میں تم کو ادھر تاپ رہا تھا۔"

بالم کھسیانہ ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ "یار، جیسے ہی جگار ہوئی۔ میں نے فوراً سیٹی بجا کر خطرے کا

سگنل دیا۔ پر تمہارا کہیں پتہ نہ تھا۔"

ٹینی نے مداخلت کی "یار! میں تو سمجھا تھا کہ آج تو دھر لیا گیا اور تیرے ساتھ مجھے بھی حوالات دیکھنا پڑے گی۔"

"اماں کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہوں۔" غازی نے ہنس کر مطلع کیا "مگر استاد، کام کچھ بنا نہیں" اس نے پرس نکال کر سامنے ڈال دیا۔ البتہ وہ مزہ آیا کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ یار ایسے موقع سے پہنچا کہ معاملہ بالکل چنا جور گرم تھا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا اور ساری تفصیل مزہ لے لے کر سنانے لگا۔ بالم اور ٹینی اس کی باتیں سن کر بار بار ہنس پڑتے۔

اس روز وہ فجر کی اذان کے وقت تک جاگتے رہے۔ سوئے تو دن چڑھے تک کسی کی آنکھ نہ کھلی۔ ٹینی کو بھی کارخانے جانا نہیں تھا۔ اور غازی اور بالم تو عرصے سے چھٹی ہی پر تھے بیکار دن تھے بیکار راتیں تھیں۔

سب سے پہلے غازی کی آنکھ کھلی۔ دونوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر وہ سیدھا حلوائی کی دکان پر گیا۔ اور گرم گرم پوریاں لے آیا۔ بالم اور ٹینی ابھی تک سو رہے تھے۔ اس نے دونوں کو جگایا۔ سب نے مل کر پوریاں کھائیں۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگائے اور زور زور سے قہقہے لگاتے رہے۔ اس روز وہ بڑے مگن تھے۔

غازی کا پروگرام تھا کہ شام کو سینما دیکھا جائے مگر ٹینی نے مخالفت کی۔ کہنے لگا "تم ساری رقم اسی طرح خرچ کر دو گے۔ تم کو تو حرام خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ ایسا بیتا نکالا جائے کہ کوئی ڈھنگ کا کام دھندا کیا جائے۔"

غازی مسکین سی صورت بنا کر بولا "اتنی سی رقم سے بھلا کیا دھندا شروع کیا جا سکتا ہے۔"

بالم نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی "اماں ٹینی بھائی ۴۰۰ روپلی سے بھی کوئی کام دھندا شروع کیا جا سکتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ احمقوں کی طرح ہنسنے لگا "یار آج فلم کا پروگرام ہو ہی جائے، بہت دن ہو گئے۔ سالی کوئی فلم ہی نہیں دیکھی۔" ٹینی کے آگ ہی تو لگ گئی۔ پہلے تو اس نے دونوں کو خوب

ڈانٹا، پھر بڑے سرپرستانہ انداز میں دیر تک سمجھاتا بجھاتا رہا۔ آخر یہ طے ہوا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کیا جائے۔ اب سوچنا یہ رہ گیا تھا کہ کس قسم کا کاروبار شروع کیا جائے کئی اسکیمیں سامنے آئیں مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

بالم، جواب تک خاموش بیٹھا تھا، چٹکی بجا کر بولا: "یار سینما کے ٹکٹوں کی بلیک کیسی رہے گی؟ مزے سے دونوں مل کر چار پانچ روپے روزانہ پیٹ لیا کریں گے اور سینما مفت میں دیکھنے کو ملے گا۔ کہو استاد کیسی کہی؟" وہ دادِ طلب نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔

غازی نے گالی دے کر کہا: "یہ سالا تو ایسی ہی سوچتا ہے۔ ابے یہاں ایک سے ایک بڑا مکرانی پڑا ہے۔ سالے ان کی داداگیری کے سامنے تمہاری کیا دال گلے گی۔ پھر پولیس کے ڈنڈے الگ کھاؤ۔ ایسا ہی دھندا کرنا ہے تو کوکین یا چرس کا کاروبار کرو۔ جس میں رقم بھی اچھی ہاتھ لگے۔ ٹکٹوں کی بلیک میں تو ہر وقت جوتا لات رہے گا۔"

ٹینی کو یہ باتیں سخت ناگوار گزریں کہنے لگا: "تم دونوں کا تو ایمان خراب ہو گیا ہے۔ جب سوچو گے بے ایمانی اور اٹھائی گیری پن کی بات۔" پھر اس نے خود ہی فیصلہ بھی صادر کر دیا۔ "میرے ساتھ رہو گے تو یہ چار سو بیس نہیں چلے گی۔ تم دونوں آج ہی جا کر ایک ایک ٹوکری خریدو اور ایمپرس مارکیٹ سے انڈا مکھن اور ڈبل روٹی لے کر کل صبح سے پھیری لگانا شروع کر دو۔ روپیہ، دھیلی روزانہ بچ ہی جایا کرے گا۔ کچھ رقم پلّے ہو جائے تو کوئی اور دھندا بتاؤں گا۔"

دونوں نے حیل وحجت کرنا چاہی تو اس نے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔

کچھ دیر بعد دونوں اٹھے اور ایمپرس مارکیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد ٹینی پھر پڑ کر سو گیا۔ شام کو آنکھ کھلی دیکھا دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ وہ گھر میں بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے کوئی نو بجے دونوں لوٹے مگر آپس میں گالی گلوچ کرتے ہوئے۔ غازی نے آتے ہی بالم کی شکایت کا دفتر کھول دیا۔

"ٹینی بھائی، اس سالے نے تو آج اپنا گلا کٹوا دیا۔ یہ دیکھو کل دس آنے پوری رقم میں سے باقی

بچے ہیں "

وہ جیب سے ریزگاری نکال کر دکھانے لگا۔ ٹینی کو دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا پوچھا "آخر ہوا کیا؟"

غازی نے بتایا "اماں میں تو انڈے خریدنے جا رہا تھا۔ اس سالے کا ایک یار مل گیا۔ اس نے ایسی پٹی پڑھائی کہ میں بھی اندھا ہو گیا۔ ریلوے کے پارسلوں کا نیلام تھا۔ اماں وہی جو بچ بچا جاتے ہیں۔ جن کا کوئی چھڑانے والا نہیں ہوتا۔ زبردستی مجھ سے ایک پارسل پر بولی لگوا دی۔ بیس روپے پر بولی چھوٹی۔ اندر سے نکلا کیا۔ گودڑ اور پتھر کے ٹکڑے۔ ریلوے والوں نے اصلی مال پہلے ہی پار کر دیا تھا۔"

بالم جواب تک مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا تڑپ کر بولا "اب یہ پوچھو کہ باقی رقم کہاں گئی" اس نے غازی کی طرف دیکھ کر کہا "اب یہ بھی کہہ دو کہ ریس چلنے کے لئے بھی میں نے ہی کہا تھا"

غازی سر کے بالوں کو کریدنے لگا "میں نے سوچا تھا کہ چلو یہاں تقدیر نے دھوکا دیا۔ شاید ریس میں قسمت لڑ جائے پر سالا آج دن ہی کچھ منحوس تھا"

ٹینی خاموش بیٹھا رہا۔ دونوں دیر تک اپنے اپنے طور پر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیر تک ٹینی کچھ نہ بولا، تو دونوں نے اس کی خوشامد شروع کر دی۔ بالم پیر دبانے کے لئے بار بار ہاتھ بڑھاتا اور ٹینی اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔ غازی نے بیڑی سلگا کر دی تو اسے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ کئی منٹ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر ٹینی جل کر دونوں کو گالیاں دینے لگا۔ دونوں بے غیرتی سے دانت نکالے ہنستے رہے۔

اب پھر دونوں پیسہ پیسہ کو محتاج ہو چکے تھے۔ بات بات پر آپس میں جھگڑا کرتے۔ ٹینی کی خوشامد کرتے اور سویرے ہی سویرے کام دھندے کی تلاش میں گھر سے نکل جاتے۔ انھی دنوں ایک روز ٹینی نے کارخانے سے واپسی پر یہ بری خبر سنائی کہ اس کا کام بھی چھوٹ گیا۔ سیٹھ نے کارخانہ بند کر دیا تھا۔ اس لیے کہ اس سال حکومت نے اسے امپورٹ لائسنس نہیں دیا تھا۔

بے روزگاری کے دنوں میں ٹینی بھی بدلنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتا۔ گالیاں بکتا۔ اس

کی طبیعت میں برابر چڑچڑا پن آتا جا رہا تھا۔ بالم اور غازی ہر وقت سہمے ہوئے رہتے تھے۔ ٹینی کی تیوری پر بل دیکھتے تو چپکے سے باہر نکل جاتے۔ اب وہ اس سے ڈرنے لگے تھے۔

غازی اور بالم تو پہلے ہی قلاش تھے۔ اب ٹینی کی حالت بھی انھی کی سی ہو گئی تھی۔ کئی کئی وقت بغیر کچھ کھائے گزر جاتے۔ تینوں مل جل کر گھنٹوں نئی نئی اسکیمیں سوچتے۔ دن دن بھر دوڑ دھوپ کرتے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ انھی دنوں کا ذکر ہے۔ ٹینی رات بھر کا بھوکا تھا۔ صبح اٹھا تو نہ چائے تھی نہ بیڑی۔ رات نیند اس کو یوں ہی کم آئی تھی۔ مزاج چڑچڑا ہو رہا تھا۔ کمرے میں اس وقت صرف بالم موجود تھا۔ غازی سویرے ہی سویرے کہیں نکل گیا تھا۔

ٹینی نے منہ ہاتھ دھونے کے لیے لوٹا لے کر گھڑے سے پانی نکالنا چاہا۔ گھڑا بالکل خالی تھا۔ وہ جھنجھلا کر بالم پر برس پڑا "تم لوگ تو سالے لاٹ صاحب ہو۔ کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مٹکے میں پانی بھر لیا ہوتا۔ میں کوئی تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ ہر کام میں ہی کروں۔"

بالم نے دیکھا کہ صبح ہی صبح نزلہ ادھر گر رہا ہے۔ اس نے جھٹ غازی کو ڈھال بنایا۔ کہنے لگا۔ "میں نے تو کل پانی بھر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے غازی صبح اٹھ کر نہایا ہے۔ یہ دیکھو دروازے کے باہر کیچڑ ہو رہی ہے۔"

ٹینی نے غازی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس وقت اتفاق سے وہ بھی آ گیا۔ پہلے ہی غصہ کیا کم تھا کہ اس بات پر اور آگ لگ گئی کہ وہ اس کی پتلون بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پہنچتے ہی چیخ کر بولا۔

"کیوں جی یہ پتلون تم نے کس کی اجازت سے پہنی۔ تمہارے باپ نے بنوا کر رکھ دی تھی کہ جب چاہا پہنا اور سالے نواب بن کر چل دیے۔"

غازی شکایت کرنے کے سے لہجہ میں بولا "دیکھو جی ٹینی تم ذرا ذرا سی بات پر باپ دادا تک پہنچ جاتے ہو۔" پھر اس نے غصہ سے اس کی پتلون اتار کر پھینک دی اور اپنی شلوار پہنتے ہوئے بڑبڑانے لگا "شلوار پھٹی ہوئی تھی۔ سالا بدن تک ننگا نظر آتا ہے۔ ایک جگہ کام ملنے کی امید پر گیا تھا۔ ذرا سی پتلون

پہن لی تو آفت مچادی۔"

ٹینی اسی درشت لہجے میں بولا۔"ہم نے ہزار دفعہ کہا کہ ہماری چیز مت چھوا کرو۔ تم تو بے غیرت ہو بے غیرت۔" اور پھر اس نے غصہ سے اٹھ کر پتلون کی موریاں پکڑیں اور جھٹر جھٹر کر کے اسے پھاڑ ڈالا۔

کمرے کی فضا بڑی مکدر ہوگئی تھی۔ ٹینی زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ بالم بھی کبھی کبھی اس کی تائید کرتا جا رہا تھا۔ غازی اس وقت ٹینی سے تو کچھ نہیں کہہ سکا۔ البتہ بالم پر برس پڑا۔ ٹینی کو اس بات پر اور بھی تاؤ آیا۔ کہنے لگا۔

"ابے اس کے سر کیوں ہو رہا ہے۔ مجھ سے کہہ۔ دادا گیری دکھانا ہے تو کہیں اور جا کر دکھاؤ۔ یہاں یہ نہیں چلے گی۔ بس ہو چکی یاری۔ بڑھاؤ اپنا ٹٹو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

غازی نے زبان سے تو ایک لفظ نہیں نکالا۔ جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اس زور سے دھکا دیا کہ ٹینی فرش پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ٹینی فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ گلا پھاڑ کر چیخا۔"ابھی نکل جا سالے، الو کے پٹھے۔"

غازی تیزی سے دروازے کھول کر باہر نکل گیا۔ بالم لمحہ بھر تک تو خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔ ٹینی کو اس کے اس طرح چلے جانے پر حیرت تو ہوئی مگر اس نے بالم کو نہ ٹوکا نہ روکا۔

دونوں کے جانے کے بعد، وہ تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ کمرے کے اندر ویرانی برس رہی تھی۔ سورج اب چڑھ کر سر پر آ گیا تھا مگر وہ اسی طرح بے سدھ پڑا رہا۔ سہ پہر ہوئی۔ شام ہو گئی۔ دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا، اب وہ دونوں یہاں کبھی نہیں آئیں گے جب اندھیرا بڑھنے لگا تو اسے خیال آیا کہ اس طرح گھر میں پڑے پڑے کس طرح کام چلے گا۔ کئی وقت کے فاقہ نے اسے بیماروں کی طرح نحیف و ناتواں بنا دیا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے اٹھا اور یہ طے کر کے گھر سے نکلا کہ آج کوئی نہ کوئی کام کی صورت نکال کر واپس آئے گا۔ کہیں دور جانے کی ہمت نہ تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ آخر خداداد کالونی میں اتنی بہت سی جو شاندار کوٹھیاں بنی ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو کام کاج مل ہی جائے گا۔ اب وہ برتن دھونے سے لے کر ہر کام کرنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔

ٹینی نے سوچا کہ سب سے پہلے وہ کس کے پاس جائے۔ سوچتے سوچتے اس کو خان بہادر صاحب کا خیال آگیا۔ ان کی کوٹھی کے نوکروں سے اس کی جان پہچان بھی تھی۔ اکثر وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ خان بہادر کو کبھی کبھار سلام کرنے کا موقع مل جاتا۔ وہ سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ اتفاق سے وہ کوٹھی کے لان میں ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ وہ ان کو سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

"سرکار کام کاج چھوٹ گیا ہے۔ بہت دن سے بے روزگار ہوں۔ دو وقت کے کھانے کا سہارا ہو جائے، تو آپ ہی کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔"

وہ اظہارِ معذرت کرتے ہوئے بولے، "بھئی مجھ کو تو فی الحال کسی آدمی کی ضرورت نہیں۔ اکرم میاں کو ایک اردلی کی پچھلے دنوں ضرورت تھی مگر اب تو انھوں نے ملازمت ہی چھوڑ دی۔ وہ تو نہیں چاہتا تھا۔ ماں نے زور دیا کہ میرا بیٹا دفتر کے کاموں سے دبلا پڑ گیا ہے۔ میں سات آٹھ سو روپلی کے لیے اس کی صحت غارت نہیں ہونے دوں گی۔ تم جانو ماں کی مامتا کے سامنے کس کا بس چلتا ہے۔ اکرم کو نوکری چھوڑنا ہی پڑی۔ اب تو وہ آئندہ مہینہ امریکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جا رہا ہے۔"

ٹینی نے سوچا یہ شخص تو نہ معلوم کب تک اپنے بیٹے کی کتھا سناتا رہے گا۔ یہ ایسی باتیں تھیں۔ جن سے اسے کوئی سروکار نہ تھا لہٰذا اس نے ہمت کر کے خان بہادر سے اجازت لی: "اچھا سرکار، پھر کسی اور وقت آؤں گا۔ ابھی ایک جگہ اور جانا ہے"

وہ کوٹھی سے باہر نکلا اور برابر غصّے سے بڑبڑاتا رہا۔ یہاں پانچ ٹکے کا سہارا نہیں یہ سالا بتا رہا ہے کہ سات آٹھ سو روپے میں میرے بیٹے کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ واہ اللہ میاں خوب ہے تمہارا انصاف۔

وہ اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ اندھیرے میں کسی سے ٹکرا گیا۔ گھبرا کر دیکھا، ایک ننگ دھڑنگ بچہ کھڑا منہ بسور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کٹورا تھا جو زمین پر گر پڑا تھا۔ بچہ کچھ دیر منہ بسورتا رہا۔ پھر ایک بار

زور سے چلا کر رونے لگا۔ سامنے کی جھگی میں سے ایک عورت چیخی "ارے کیا ہو گیا حرامی منہ سے تو بول۔ روئے کیوں جا رہا ہے" ٹینی نے سوچا عورت بڑی تیز معلوم ہوتی ہے۔ بلا کی طرح پیچھے پڑ جائے گی۔ وہ گھبرا کر برابر والی سڑک پر مڑ کر ایک بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک خوفناک کتا نکل کر اس پر جھپٹا۔ ٹینی گھبرا کر چیخ اٹھا۔ فوراً ہی کسی نے آواز دی "روبی، روبی، ادھر آؤ" کتا دم ہلاتا ہوا اس کے قدموں پر جا کر لوٹنے لگا۔ اس شخص نے وہیں سے پوچھا "تم کو کس سے ملنا ہے؟" ٹینی خاموشی سے اس کے پاس چلا گیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے دس بارہ سال کا ایک بچہ نکلا اور اس شخص سے کہنے لگا "پاپا نیلی کھانا نہیں کھاتی۔ بہت شور مچا رہی ہے" اسی اثناء میں ایک پیاری سی بچی منہ بسورتی ہوئی آ گئی۔ وہ پوچھنے لگا "نیلو بیٹا کیا بات ہے"

بچی سسکیاں بھرتی ہوئی بولی "وہیں لے چلو پاپا، جہاں کل کھانا کھایا تھا ہم یہاں نہیں کھائیں گے" اس شخص نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ اس کو چمکانے لگا "ہوٹل چلیں گے ہم اپنی نیلو کو لے کر ابھی چلوں گا" اس نے ڈرائیور کو آواز دی "ڈرائیور گاڑی نکالو، ہم باہر جائیں گے"

اس نے ٹینی کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ بچی کو گود میں لیے ہوئے اندر چلا گیا۔ اب وہاں کھڑا رہنا بے کار تھا اور سب سے زیادہ اس بڑے بڑے بالوں والے خوفناک کتے کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کوٹھی سے باہر آ گیا۔ وہاں سے وہ دل برداشتہ لوٹا۔ اسے یہی مناسب معلوم ہوا کہ واپس گھر چلا جائے، لیکن بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا گھر جا کر بھی کیا کرے گا چلو ایک آدھ جگہ اور کوشش کر دیکھوں۔ شاید کہیں قسمت لڑ جائے۔ واپس تو بہر حال جانا ہی ہے۔ اس خیال سے ذرا ڈھارس بندھی۔ وہ ڈرتا جھجکتا ایک اور کوٹھی پر پہنچا۔ پھاٹک ہی سے اس نے چاروں طرف چور کنا نظروں سے دیکھا۔ کہیں آس پاس کوئی کتا تو نہیں ہے مگر میدان صاف تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا مگر وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ جب زیادہ دیر ہو گئی تو اس نے سوچا، پتہ نہیں کوئی اس طرح یہاں کھڑا دیکھ کر کیا سوچے۔ لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ مشرقی کمرے کا دروازہ کھول کر ایک ادھیڑ آدمی باہر آیا۔ وضع قطع سے خانساماں معلوم ہوتا تھا۔ ٹینی نے آہستہ سے پوچھا "صاحب

اندر ہیں ؟"

وہ بولا۔"ہاں اندر ہی ہیں"۔ پھر اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔"سامنے بیٹھے ہیں جا کر مل لو"۔ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ ٹینی آگے بڑھا۔ دروازے پر پہنچا۔ جھجکتے ہوئے کمرے کا پردہ سرکایا اور دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔

اندر سے کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔"کون ہے ؟ اندر آجاؤ۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ وہ بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ مونچھیں ڈاڑھی صفا چٹ۔ سر چندلا۔ آنکھوں پر چوڑے فریم کا چشمہ۔ اس وقت وہ کوئی انگریزی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ٹینی سے پوچھنے لگا۔"کیوں بھئی، کیا کام ہے ؟"

اس کا لہجہ بڑا نرم تھا۔ ٹینی کو ڈھارس بندھی۔ گڑگڑا کر اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ خاموشی سے ٹینی کی باتیں سنتا رہا۔ ٹینی اپنی بات ختم بھی نہ کر سکا تھا کہ ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ ادب سے گویا ہوا۔"ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔"

ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر ایک موٹی تگڑی عورت کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ عورت نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔"دیکھیے ڈاکٹر صاحب! ان کی گردن پر آج صبح سے یہ سرخ نشان نظر آرہا ہے۔ یہ برابر اس بات پر مصر ہیں کہ مچھر کے کاٹنے کا نشان ہے۔ ان کو اپنی صحت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ دیکھیے تو کیسا لال ہو رہا ہے میرا تو دل پریشان ہو رہا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب ان کو تو یونہی وہم ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جھک کر اس کی گردن کا اچھی طرح معائنہ کیا اور ایک کاغذ پر نسخہ لکھ کر بولا "بازار سے یہ مرہم منگوا لیجئے۔ سوتے وقت لگا لیجئے گا۔ میرا خیال ہے۔ اس سے یہ داغ مٹ جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک ٹھیک نہیں ہوا تو انجکشن لگا دوں گا۔"

ساری ہدایات دے کر اس نے اپنا بیگ سنبھالا اور چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ عورت نے اپنا پرس کھولا اور ڈاکٹر کو فیس کے پچاس روپے دے دیئے۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ عورت وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

باتیں کرتے کرتے اس کی نظر ٹینی پر پڑ گئی. پوچھنے لگی:" یہ کون ہے؟"

اس کا خاوند بولا:" بے چارہ پریشان ہے. ملازمت چاہتا ہے."

وہ بگڑ کر بولی:" آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے پاس یونہی زیادہ آدمی ہیں مگر آپ کو اس سے کیا غرض، جو آیا، اس کو رکھ لیا. نوکروں کی پوری پلٹن کی پلٹن ہوگئی اور سب حرام خور اور نکمے ہیں."

وہ ٹینی کی جانب متوجہ ہوئی:" نا بابا، ہم کو کوئی نوکر ور کر نہیں چاہیئے." مگر ٹینی وہاں سے ہٹا نہیں۔ گردن جھکائے کھڑا رہا۔ اس نے عاجزی سے کہا:" کام کاج نہیں مل سکتا تو آپ دس بیس روپے سے مدد کر دیجئے. اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے. میں اس سے کوئی چھوٹا موٹا دھندا:"

عورت نے اس کی بات پوری سنی بھی نہیں. گرج کر بولی:" لو اور سنو یہاں کوئی خیرات بٹتی ہے کہ آ کر پیر دے جاؤ." ٹینی نے سوچا اب جو یہاں ٹھیرا تو یہ حرام زادی نوکر کو بلوا کر نکلوا دے گی. اس نے بڑی خون خوار نظروں سے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کمرے کے باہر آگیا۔

سڑک پر پہنچ کر اسے بالم اور غازی یاد آگئے۔ ان کی یاد کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں یاد آگئیں اس نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا. پھاٹک پر چوکیدار بھی نہیں تھا کتا بھی نگرانی کے لئے نہیں تھا۔ کوٹھی کی چھت پر پیپل کا ایک گھنا پیڑ جھکا ہوا تھا. موقع اچھا تھا۔ وہ شکاری کی سی تیز نظروں سے اس طرف یک لخت گھورتا رہا. پھر خود ہی چونک پڑا. نہیں جی: یہ ٹھیک نہیں. معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں میرا امتحان لے رہے ہیں. یہ تو آزمائش ہے. آزمائش۔ اس نے اپنے گالوں پر کس کس کے دو طمانچے لگائے۔ کان پکڑے اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچ کر دیکھا کہ دروازہ کھلا تھا۔ اندر روشنی بھی ہو رہی تھی. گھبرایا ہوا اندر گیا. غازی اور بالم وہاں موجود تھے. اس کو دیکھتے ہی دونوں نے کان پکڑ کر گردن جھکا لی۔ اس حالت میں وہ سرکس کے مسخروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

ٹینی کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پوچھنے لگا" تم دونوں دن بھر کہاں رہے؟"

بالم بولا" بات بعد میں ہوگی۔ پہلے کچھ کھالو۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں۔ بس اب آ جاؤ"۔ اتنا کہہ کر اس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور کباب نکال کر سامنے رکھ دیئے۔

غازی کہنے لگا" صبح سے ایک دانہ بھی حلق میں گیا ہو تو سؤر کھایا ہو"۔ اس نے ٹینی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

تینوں کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک شکوے شکایت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر انہوں نے اس موضوع پر بحث چھیڑ دی کہ اب کیا کیا جائے۔ باتوں باتوں میں بالم نے مشورہ دیا کہ اس مکان کو پگڑی پر اٹھا دیا جائے۔ ایک آدمی کئی دن سے اس کے لیے کہہ بھی رہا ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ پانچ سو تک دے دے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس رقم سے کوئی کام شروع کیا جائے۔

لیکن ٹینی اس کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ کہنے لگا" یہ بھی سوچا کہ رہو گے کہاں؟"

بالم بولا" اماں، کہیں بھی پڑ رہیں گے۔ تھوڑے دنوں کی تو بات ہی ہے۔ کام دھندا چل گیا تو رہنے کا ٹھکانہ بھی ہو جائے گا۔ یوں کب تک بھوکے مرتے رہیں گے؟"

ٹینی پھر بھی رضامند نہ ہوا۔

غازی نے دبی زبان سے تجویز پیش کی" کہو تو ایک روز پھر قسمت آزمالیں۔ میں نے کئی جگہ مرتع لگایا ہے۔ قسم خدا کی داؤ پڑ گیا تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

ٹینی بھنا کر گالیاں بکنے لگا۔ جب ذرا اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو غازی اور بالم نے پھر وہی سوال دہرایا کہ آخر کیا کیا جائے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اور فوری طور پر کرنا تھا۔ بڑی حیل وحجت کے بعد ٹینی اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ہفتہ بھر تک کام کاج تلاش کیا جائے اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو مکان پگڑی پر دے کر اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا جائے۔

سویرے اٹھ کر تینوں کام دھندے کی تلاش میں نکل گئے۔ سب سے پہلے ٹینی واپس آیا۔ اس

نے دیکھا۔ پاس پڑوس کے گھروں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پوری عمارت قریب کی کوٹھی میں رہنے والے حاجی کریم نے اپنے کلیم کی بنیاد پر الاٹ کرالی تھی۔ پندرہ روز کی مدت میں عمارت خالی کرنے کا نوٹس بھی مل چکا تھا۔ ٹینی کو یہ اطلاع ملی تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سخت پریشان ہوا۔ رات گئے غازی اور بالم لوٹے۔ ٹینی نے ان کو بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہوگئے۔

دوسرے روز صبح عمارت میں رہنے والے سارے ہی مرد اکٹھا ہوئے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کر رہا تھا۔ گھنٹوں بحث ہوتی رہی۔ آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ حاجی کریم سے ایک وفد کی صورت میں ملاقات کی جائے۔ حاجی کو اپنی پریشانیوں سے آگاہ کیا جائے اور یہ درخواست کی جائے کہ وہ مدت سے رہتے بستے لوگوں کو بے دخل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس عمارت کے بجائے کوئی اور کوٹھی بنگلہ اپنے نام الاٹ کرالے۔

پروگرام کے مطابق شام کو ایک وفد عبداللہ خاں کی سربراہی میں حاجی کریم کی کوٹھی پر پہنچا۔ عبداللہ سن رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ معاملہ فہم بھی تھا۔ مزاج کا بھی ٹھنڈا تھا۔ بات کرنے کا ڈھب بھی جانتا تھا۔ نمازی اور پرہیزگار تھا۔ سب اس کی عزّت کرتے تھے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر اسے متفقہ طور پر سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ وفد پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں ٹینی بھی شامل تھا۔

حاجی کریم عمر میں عبداللہ خاں سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ خوب گھنی سفید داڑھی تھی۔ جسم بھاری بھرکم تھا چہرے سے خوش حالی ٹپکتی تھی۔ میریٹ روڈ پر ہارڈ ویئر کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بھی کاروبار تھا۔ بارسوخ تھا۔ اعلیٰ حکام تک رسائی تھی مگر طبیعت میں تکبر نہ تھا۔ اس نے وفد کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ عبداللہ خاں سے مسکرا کر پوچھا: "کہو میاں عبداللہ کیسے آنا ہوا؟" اس نے جان بوجھ کر بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ انجان بننے کی کوشش کی۔

"سرکار، ایک درخواست لے کر آپ کے پاس آئے تھے۔" عبداللہ خاں نے عاجزی سے کہا۔

"کیسی درخواست۔ خیریت تو ہے؟"

"اجی، یہ تو آپ کو خبر ہی ہوگی کہ ہم لوگ جس عمارت میں رہتے ہیں۔ اسے خالی کرنے کا نوٹس ملا ہے۔"

عبداللہ نے صورت حال بیان کی: "بڑی مشکل سے سر چھپانے کا ٹھکانہ ملا ہے اب یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے۔"

"بھئی جھگیوں میں تو رہنا ہی ہے، کہیں بھی ڈال لو۔" حاجی کریم نے کہا۔ "اللہ کے نہ جانے کتنے بندے اسی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔" اس کے چہرے سے نرمی غائب ہو گئی۔ "اس وقت تو تم نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو تم کو بستر بوریا اٹھا کر یہاں سے جانا ہی تھا۔ اب تو خالی کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ سرکاری حکم ہے۔"

"سرکار، آپ اتنی مہربانی کریں۔ اس عمارت کے بجائے کوئی اور الاٹ کرالیں۔" عبداللہ خاں نے گڑگڑا کر کہا۔ "آپ کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ اوپر تک پہنچ بھی ہے۔ ہم لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعائیں ہی نکلیں گی۔"

"اماں، عبداللہ خاں تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔" حاجی کریم بے رخی سے گویا ہوا۔ "آج کل کے زمانے میں الاٹمنٹ حاصل کرنا۔ تم نے ہنسی ٹھٹھا سمجھ رکھا ہے۔ ہر شخص تو بغل میں کلیم کا بستہ دبائے الاٹمنٹ کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ تم کو کیا خبر کہ کتنی بھاگ دوڑ کے بعد یہ الاٹمنٹ ملا ہے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے۔ پندرہ ہزار تو صرف الاٹمنٹ آرڈر نکلوانے کے لیے رشوت دی ہے۔"

"ضرور دی ہو گی جی۔ رشوت کے بغیر تو کوئی کام بنتا ہی نہیں۔" عبداللہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لہجہ میں رقت پیدا کرتے ہوئے گھگیا کر کہا۔ "ہم تو یہ چاہتے تھے کہ آپ کے زیر سایہ پڑے رہیں۔ کچھ ہماری پریشانی کا بھی خیال کریں۔"

"اپنی پریشانی تو تم کو یاد رہ گئی مگر میری پریشانی کا ذرا خیال نہ آیا۔" حاجی کریم کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر عبداللہ تو خاموش ہو گیا مگر مُنّی سے خاموش نہ رہا گیا۔ "حاجی صاحب! آپ کے پاس تو رہنے کو پہلے ہی اتنی بڑی کوٹھی موجود ہے۔"

حاجی کریم نے مُنّی کو پوری بات کہنے نہ دی فوراً مداخلت کی۔ "لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہ کوٹھی کیا ہے۔ ایسی کتنی ہی کوٹھیاں اور بنگلے چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہاں اس کے عوض کلیم میں ملا ہی کیا ہے۔" اس نے منہ بگاڑ کر نہایت بے مروتی سے کہا۔ "صاف بات یہ ہے کہ یہ جگہ تو تم کو خالی ہی کرنا ہو گی۔

خیریت اسی میں ہے کہ اپنا، اپنا سامان اٹھاؤ اور کہیں اور ڈیرا ڈالو۔ قانون سے ٹکر لینے کی کوشش کروگے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ جس نے بھی ہیکڑی دکھائی، ذرا بھی سرکشی کی، وہ جیل کی ہوا کھائے گا۔" اس نے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔" ابھی وقت ہے۔ ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔ بعد میں پچھتاؤ گے۔"

وفد کے ارکان میں سے کسی کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سب منہ لٹکائے چپ بیٹھے رہے۔ حاجی کریم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔" اچھا بھئی، مجھے نواب کھانا کھانا ہے۔ میرا کام تم کو نشیب و فراز سے خبردار کرنا تھا، وہ میں نے کر دیا۔ آگے تمہاری مرضی۔" وہ مڑا۔ برابر والے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

وفد کے لیے اب ٹھیرنا فضول تھا۔ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حاجی کریم کی کوٹھی سے نکل کر باہر سڑک پر آگئے اور بوجھل قدموں سے اپنے ٹھکانے کی جانب چلے۔ سب کے چہروں سے غم و غصہ عیاں تھا۔

"اماں کیسی اونچی، اونچی ہانک رہا تھا۔" شیخ عنایت نے چلتے چلتے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔ وہ وفد کے ارکان میں سب سے زیادہ عمر دراز تھے۔ پریشان حال بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ "کہتا تھا عالی شان کوٹھیاں اور بنگلے چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں نے اس کی وہ کوٹھیاں بھی دیکھی ہیں اور بنگلے بھی۔ اپنی طرح یہ بھی آگرے ہی کا ہے۔ نائی کی منڈی میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوتا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ بھی ثابت نہ تھا۔"

"اماں شیخ جی، تم سچ کہہ رہے ہو؟" عید دکبابئے نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ وہ بھی پانچ رکنی وفد میں شامل تھا۔

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔" شیخ عنایت نے تڑپ کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔" اسے کیا میں تو اس کے باپ کو بھی جانتو ہوں۔ وہ بے چارہ تو ساری زندگی خوانچہ اٹھا کر گلی گلی پھیری لگاتا رہا۔ اس نے کچھ پڑھ پڑھا لیا تھا۔ کچہری کے پھاٹک پر بوری پر بیٹھا عرضیاں درضیاں لکھا کرتا تھا۔ یہاں آکر دیکھا تو ٹھاٹھ باٹ ہی اور تھے۔ پتہ نہیں حاجی کیسے بن گیا۔ میں تو کہو ہوں، جس طرح جعلی کلیم دلیم کا چکر چلا کر جائیداد اور کوٹھیاں الاٹ کروا رہا ہے۔ ایسے ہی اس نے خود کو حاجی بھی بنا لیا ہوگا۔"

"اجی، اب تو وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔" عید دکبابئے نے تبصرہ کیا۔" ایسے ویسے کو تو گھاس نہیں

ڈالتا۔ دیکھتے نہیں کس شان سے موٹر میں بیٹھ کر کوٹھی سے نکلتا ہے۔"

"ہاں بھئی۔ اپنی اپنی قسمت ہے" عبداللہ خاں نے آہ سرد کھینچی: "اللہ جسے دیتا ہے چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔"

وفد کے ارکان اسی طرح باتیں کرتے ہوئے نڈھال اور شکستہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ سب ہی دل برداشتہ تھے مگر ٹینی کا حوصلہ بلند تھا۔ اس نے دوسروں کا بھی حوصلہ بڑھایا اور سب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ چاہے پولس آئے یا فوج، عمارت کو کسی قیمت پر خالی نہ کیا جائے۔ اس نے اونچی آواز سے کڑک کر کہا: "اجی یہاں سے ہمیں اٹھانا دل لگی نہیں ہے۔ اتنے سارے لوگ، جم کر سامنے آگئے تو کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ یہ جگہ ہم سے خالی کرالے۔" اس کی باتوں سے لوگوں کو خاصی ڈھارس ہوئی۔

سب نے تہیہ کر لیا کہ عمارت خالی کرنے کے بجائے ڈٹ کر صورت حال کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ خبر اڑتی اڑتی حاجی کریم تک پہنچی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا۔ عبداللہ خاں کو اپنے ایک ملازم کے ذریعہ بلایا عمارت خالی کرنے کی بات چھیڑی۔ عبداللہ خاں نے اپنی اور دوسروں کی پریشانی سے ایک بار پھر اس کو آگاہ کیا۔ اس دفعہ حاجی نے خفگی سے اجتناب برتا۔ لہجہ میں نرمی اور حلاوت پیدا کرتے ہوئے ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ پیش کش کی کہ عمارت خالی کرنے والے ہر خاندان کو وہ جھگی بنانے کے لیے پچاس روپے دے گا۔

عبداللہ خاں نے واپس پہنچ کر سب کو حاجی کریم کی پیش کش سے آگاہ کیا۔ اس کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حاجی کریم سے بہت متاثر تھا۔ اسے نیک دل اور خدا ترس سمجھتا تھا۔ کچھ لوگ حاجی کریم کی پیش کش قبول کرنے پر نیم رضامند بھی ہو گئے مگر ٹینی اور اسی طرح کے چند جوشیلے نوجوانوں نے مخالفت کی تو وہ بھی اکھڑ گئے۔

عبداللہ نے حاجی کریم کو سب کا عندیہ بتایا تو اس دفعہ بھی اس نے نرمی سے کام لیا۔ اپنی پیش کش پچاس سے پچھتر کر دی اور عبداللہ خاں کو دو سو روپے دینے کا وعدہ کیا۔ یہ رشوت کام کر گئی۔ عبداللہ خاں نے اس دفعہ نہایت رازداری سے کام لیا۔ ۷۵ روپے معاوضہ لے کر عمارت خالی کرنے پر لوگوں کو چپکے ہی چپکے آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی خاندان عبداللہ خاں کے ذریعہ رقم لینے کے بعد عمارت چھوڑ

کر چلے گئے مگر بیشتر خاندان جمے رہے۔ ان میں ٹینی بھی شامل تھا۔ بالم اور غازی اس کے ساتھ مرنے مارنے پر پوری طرح تیار تھے۔ عبداللہ خاں نے ایسے خاندانوں کو سمجھا بجھا کر اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر ایک رات وہ بھی اپنا سامان اٹھا کر چلا گیا۔

نوٹس کی معیاد ختم ہوگئی مگر عمارت خالی کرانے کے لیے نہ کوئی سرکاری اہل کار آیا، نہ حاجی کریم کا کوئی کارندہ یا ملازم۔ دن گزرتے رہے۔ مہینہ بھر سے زیادہ عرصہ ہوگیا۔ ٹھیرنے والے ٹھیرے رہے۔ اب وہ مطمئن نظر آتے تھے اور جو لوگ عمارت خالی کر کے چلے گئے تھے۔ ان کی ناسمجھی پر کف افسوس ملتے تھے۔

ٹینی، غازی اور بالم میں سے کسی کو اب تک کام کاج نہیں ملا تھا لیکن انھی دنوں بالم کا ایک شناسا رکشا والا اتفاق سے بیمار پڑ گیا۔ بالم اس کا رکشا لے کر چلانے لگا۔ اس سے جو کچھ مل جاتا تینوں کسی نہ کسی طور پیٹ بھر لیتے۔ مکان پگڑی پر اٹھانے کی بات چیت پھر شروع ہوگئی تھی۔ پچھلے دنوں تو کوئی اس ڈر سے آمادہ نہ ہوتا کہ کہیں خالی نہ کرنا پڑے۔

ایک روز غازی کہیں سے سینما کا پاس لے آیا۔ تینوں فلم دیکھنے گئے اور کوئی بارہ بجے لوٹے۔ انھوں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ گیس بتی جل رہی تھی۔ لوگ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ بچے زور زور سے رو رہے تھے۔ تینوں گھبرائے ہوئے قریب پہنچے دیکھا پولس [illegible] ٹ بڑی جمعیت موجود تھی۔ سڑک کے ایک طرف سامان کا جگہ جگہ ڈھیر لگا تھا۔ پوری عمارت پولس نے خالی کرا لی تھی۔ عورتیں رو رو کر سارہی بپتا سنا رہی تھیں کہ کس طرح گھروں میں گھس گھس کر ان کو زبردستی کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ کیوں کر ان کا سامان اٹھا اٹھا کر پھینکا گیا۔ مرد خاموش تھے۔ ان میں سے کچھ کو پولس پکڑ کے تھانے لے گئی تھی۔ ان پر ہنگامہ اور بلوہ کرنے کا الزام تھا۔

غازی اور بالم آپے سے باہر ہوگئے۔ گالیاں بکنے لگے۔ مگر ٹینی نے سمجھا بجھا کر انھیں ٹھنڈا کیا۔ دونوں کو ساتھ لے کر اپنا سامان تلاش کرنے لگا۔ دیر تک ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بعد کچھ سامان ملا۔

وہ رات انھوں نے سامنے میدان میں بسر کی۔ سردی ختم ہو چکی تھی مگر رات بھر اس شدت کی اوس گری کہ وہ بھیگ کر رہ گئے۔ سویرے اٹھے تو ہر ایک کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میدان میں پڑے ہوئے دوسرے لوگوں کا حال بھی ان سے مختلف نہ تھا۔ کوئی کھانس رہا تھا، کوئی درد سے ہائے ہائے کر رہا تھا۔

میدان رفتہ رفتہ خالی ہوتا گیا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا چلا گیا۔ مگر ٹینی اڑ گیا۔ وہ کہیں نہ گیا۔ بالم اور غازی بھی اس کے ساتھ ٹھیرے رہے۔ تینوں نے ٹوٹی پھوٹی جھگیوں کے ملبے سے بانس نکالے، چٹائیاں اکٹھا کیں اور ایک گھنے درخت کے تنے کے سہارے سر چھپانے کا ٹھکانہ بنا لیا۔

عمارت کے خالی ہوتے ہی حاجی کریم نے ادھوری تعمیر کو مکمل کرانے کے لیے کام شروع کرا دیا۔ بالم اور غازی روز صبح اٹھ کر زیرِ تعمیر عمارت کی جانب دیکھتے تو ان کا خون کھولنے لگتا۔ وہ حاجی کریم اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ایسے ایسے جائز اور ناجائز رشتے جوڑتے کہ اگر سن لیتا تو دونوں کو عمارت کی دیواروں میں چنوا دیتا۔ البتہ ٹینی خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہتا۔ اب اس نے ہنسنا بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت گم صم رہتا۔ نوکری کی تلاش بھی چھوڑ دی تھی۔ اس کی صحت گرنے لگی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں میں ویرانی چھائی رہتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ادھوری اور اجڑی ہوئی عمارت کی جگہ ایک بڑی شاندار کوٹھی ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس کی دیواریں اجلی اجلی نظر آتیں۔ دروازے تازہ پالش سے جھلکتے۔ دریچوں پر ریشمی پردے لہراتے۔ کوٹھی تعمیر ہو گئی تو ایک رات زبردست جشن ہوا۔ حاجی کریم کے بڑے بیٹے نے، جو باپ کی بہ نسبت تعلیم یافتہ اور روشن خیال سمجھا جاتا تھا، ایک شاندار ہاؤس وارمنگ پارٹی دی۔ اس میں سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام اور دیگر معززین نے بھی شرکت کی۔ کوٹھی کے سامنے میدان میں ہر طرف موٹریں ہی موٹریں نظر آتی تھیں۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ برپا رہا۔

رات کے پچھلے پہر غازی کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ ٹینی نے اس کے سرہانے سے چاقو نکال لیا ہے اور خاموش کھڑا انگلی پھیر پھیر کر دھار کی تیزی دیکھ رہا ہے۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ بڑا ڈراؤنا

نظر آرہا تھا۔ غازی دم سادھے پڑا رہا۔ ذرا دیر بعد ٹینی آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ جب وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا تو غازی نے بالم کو جگایا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔ دونوں نے سوچا، معلوم ہوتا ہے کہ ٹینی آج کہیں موقع سے گیا ہے۔ غازی کہنے لگا۔" وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ سالی چوری چکاری کی ایسی چاٹ ہے کہ ایک دفعہ اس کا چسکہ لگ جائے تو پھر کہاں چھٹتی ہے۔"

بالم بولا۔" ہاں جی۔ بھلا کہیں ایمان داری سے کام چلتا ہے آج کل۔ سالا خواہ مخواہ بڑا املاتن بنا گھومتا ہے۔ اپنا تو کباڑا کرا دیا۔ یار یہاں کی دھوپ میں رکشا چلانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اماں سر بھن کے رہ جاتا ہے۔"

دونوں دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ انھیں ٹینی کی واپسی کا انتظار تھا۔ صبح کی سفیدی پھیلنے سے پہلے ان کو سڑک پر ٹینی نظر آیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ آن کی آن میں وہ ان کے سامنے تھا۔

دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ غازی بولا۔" اماں کہاں گئے تھے؟"

ٹینی نے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔" شی" دونوں نے دھندلی روشنی میں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ جس سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ دونوں کانپ اٹھے۔ ٹینی نے کپڑے کی ایک پوٹلی ان کے سامنے ڈال دی۔ آہستہ سے بولا۔" بیس ہزار سے کچھ کم ہیں۔ سالو اس کو لے کر بھاگ جاؤ۔ میں نے تو وہاں سب کا صفایا کر دیا۔ پانچوں کے پانچوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ سب کو قتل کر دیا، ایک ایک کو!" وہ شرابی کی طرح جھوم جھوم کر بول رہا تھا۔ پھر اسی عالم میں غصّے سے چیخا۔" ابے اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ نکل جاؤ۔ دن چڑھنے سے پہلے پہلے یہاں سے دور چلے جاؤ۔ اس وقت تک کسی کو کر جا کر کو پتہ نہ چلے گا۔"

غازی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔" اور تم؟"

ٹینی ہنس دیا۔" میں، میں تو سیدھا تھانے جا رہا ہوں۔"

بالم تڑپ کر بولا۔" نہیں ٹینی بھائی یہ نہیں ہو سکتا۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو!"

ٹینی نے ڈپٹ کر کہا۔ "بڑا آیا سالا ہمدرد بن کے۔ ابے اب جاتے ہو کہ نہیں۔" اس نے دونوں کے سامنے چاقو کر دیا۔

دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ غازی کچھ کہنے کے لیے ٹھٹھکا تو ٹینی نے زور سے گالی دی۔

"جا تیری تو..." اور وہ ان کی طرف لپکا۔

دونوں نے رقم کی پوٹلی جلدی سے اٹھائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ دور جا کر وہ ٹھہر گئے۔ دونوں نے دیکھا ٹینی خون آلود چاقو لیے شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا سامنے سڑک پر جا رہا تھا۔ صبح کاذب کی ہلکی سفید روشنی میں وہ ایک کبڑے سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔

دونوں آگے بڑھے اور تیز تیز قدم اٹھاتے اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔ وہ ٹینی کی ہدایت کے مطابق جلد سے جلد کراچی سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔

میموریل

شام ہوتے ہی ٹوٹو نے پھر وہی حرکت کی۔ نہ جانے اس بچہ کو کیا ہو گیا تھا۔ ادھر اندھیرا ہوا اور ٹوٹو غائب۔ ڈھنڈیا پڑی۔ دیکھا، میلے کپڑوں کی ٹوکری کے اندر پڑا گہری نیند سوتا ہے۔ اس کی عجیب و غریب عادت نے مجھے خواہ مخواہ الجھن میں مبتلا کر دیا۔

پچھلے مہینے میں نے بچوں کی نفسیات کے بارے میں کچھ کتابیں خریدی تھیں۔ ان سے استفادہ کیا۔ کئی کتابوں کے مطالعہ کے بعد مشہور ماہر نفسیات کارل ژنگ کی کتاب "بچوں کی انوکھی عادتیں" کارآمد نظر آئی۔ اس میں بچوں کی بعض حیرت انگیز عادتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً ایک بچے کی یہ عادت تھی کہ رات کو جب تک مرغ کی بانگ نہیں سن لیتا، اس وقت تک اس کو نیند نہ آتی، دوسرے کو لکڑی کترنے کا عارضہ تھا، اس نے گھر کا سارا فرنیچر کتر کتر کر ستیاناس کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور بچے کی عادت تھی کہ چراغ جلے اس پر اچانک غنودگی طاری ہو جاتی۔ جب تک ریڑھ کی ہڈی پر ہلکی سی ضرب نہ لگتی اس کی غنودگی ختم نہ ہوتی۔ غرضیکہ بچوں کی ایسی ہی اور بھی طرح طرح کی عادات اور اطوار کا کتاب میں ذکر تھا۔ ان کا علاج معالجہ بھی تجویز کیا گیا تھا۔

مگر ٹوٹو نے جو انوکھی عادت اختیار کی تھی، کارل ژنگ کی تصنیف میں اس کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ البتہ کارل ژنگ نے یہ ضرور بتایا تھا کہ بچوں میں اور بھی ایسی انوکھی اور دلچسپ عادتیں پائی جاتی ہیں، جن کا ہنوز تجزیہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کا خیال ہے کہ بچوں میں ایسی عجیب و غریب عادتیں اس لئے پیدا

ہو جاتی ہیں کہ ان کے دماغ کی بعض رگیں ضرورت سے زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ اس کا علاج اس نے یہ بتایا تھا کہ رات کو سونے سے قبل روغن زیتون میں شورہ ملا کر بچّہ کے تمام جسم کی مالش کی جائے تو آفاقہ ہو جاتا ہے۔

میں نے کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد سوچا۔ کارل ژنگ نے تو بہت مہنگا نسخہ تجویز کیا۔ اس لئے کہ چند برس پہلے جب میرے سر کے بال پت جھڑ کی مانند تیزی سے گرنے لگے تھے تو کسی نے روغنِ زیتون استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت روغنِ زیتون کی ایک شیشی کی قیمت نو روپے تھی۔ اب ستائیس نہیں تو کم از کم بیس بائیس روپے تو ضرور ہو گی۔

اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ بیوی نے قریب آ کر پوچھا "کس سوچ میں بیٹھے ہیں؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

سوچ رہا تھا یہ اپنا ٹوٹو روزانہ شام کو جس طرح میلے اور گندے کپڑوں میں جا کر سو جاتا ہے۔ "یہ تو بڑی بری عادت ہے" میں نے اپنی ذہنی پریشانی کا اظہار کیا۔

لیکن میری پریشانی کو سمجھنے اور اس پر ہمدردی سے غور کرنے کے بجائے وہ بگڑ کر بولی۔ "آپ نے مکان ہی ایسی خراب جگہ لیا ہے۔ دن بھر تو گلی کے گندے بچّوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اب اس کی عادت گندے اور میلے کپڑوں میں سونے کی نہ پڑے گی تو کیا صاف ستھرے بستر پر نیند آئے گی۔ جیسا ماحول ہو گا ویسی ہی بچے کی اٹھان ہو گی۔"

بات تو اس نے بڑے پتے کی کہی مگر اس نیک بخت کو یہ نہیں معلوم کہ اب وہ زمانہ تو گیا جب کہیں رہائش اختیار کرتے وقت اور سہولتوں کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ پاس پڑوس کیسا ہے۔ اس وقت تو گھوڑے اصطبل میں اور انسان مکانوں میں رہتے تھے۔ اب تو انسان اور گھوڑے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں جس کو سر چھپانے کی جہاں جگہ مل جاتی ہے۔ وہیں ڈیرا ڈال دیتا ہے۔ اگر مگر کے پھیر میں پڑا تو گیا کام سے۔

ایسی باتیں میں اکثر سوچتا ہوں، لیکن بیوی سے کبھی ان کا اظہار نہیں کرتا۔ حالانکہ اسے "نور نامہ" اور "دعائے گنج عرش" منہ زبانی یاد ہیں "بہشتی زیور" اور میلاد شریف کی کتابیں وہ فر فر پڑھ لیتی ہے اور قرآن شریف

کا ناظرہ چھٹپن ہی میں ختم کر لیا تھا۔ سنا ہے آمین جسے عرف عام میں نشرہ کہتے ہیں، بہت دھوم دھام سے منائی گئی تھی، مگر یہ ساری تعلیم گھر کی چار دیواری کے اندر ایک نابینا حافظ جی اور بوڑھی استانی سے حاصل کی تھی کبھی اسکول نہیں گئی۔ ماں باپ نے اس ڈر سے نہ بھیجا کہ زیادہ پڑھ لکھ کر محلے کے عاشق مزاج لونڈوں سے آنکھیں لڑانے کے ساتھ ساتھ پرچے بازی نہ کرنے لگے۔ ان کے ناموس پر حرف آئے اور رسوائی کا باعث بنے۔

میں چونکہ اخبار کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں اور انگریزی رسائل اور جرائد بھی پڑھتا ہوں لہٰذا زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے معاملہ میں خاصا روشن خیال واقع ہوا ہوں لیکن آپ اس مغالطہ میں ہرگز مبتلا نہ ہوں کہ میں یہ رسائل اور جرائد مقررہ قیمت ادا کر کے خریدتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مہینے کی آخری تاریخوں میں جب جیب میں اتنی رقم بھی نہیں ہوتی کہ کسی اچھے ریستوراں میں بیٹھ کر یار دوستوں کے ساتھ شام گزاری جائے یا مار دھاڑ سے بھرپور ہالی وڈ کی نئی فلم دیکھی جائے تو اس کڑکی کے عالم میں کسی کباڑیے سے نہایت سستے داموں پر راتوں کی نیند حرام کر دینے والا انگریزی کا کوئی ناول یا "نیوز ویک"، "ٹائم"، "پوسٹ"، "لائف" اور اسی قبیل کے دوسرے جرائد کے پرانے شمارے خرید لیتا ہوں۔ ان میں ایک آدھ سنسنی خیز کہانی، کوئی حیرت انگیز فیچر، کچھ پھڑک دار اسکینڈل، کچھ پلنگ توڑ تصاویر، غرضیکہ اتنا چٹ پٹا مسالہ ہوتا ہے کہ رات کو سونے سے قبل وہ لمحات، جو کبھی کبھی دوبھر ہو جاتے ہیں، مزے سے کٹ جاتے ہیں۔ ان جرائد کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ انگریزی کی استعداد بڑھتی ہے جو میرے ایسے ملازم پیشہ آدمی کے لئے ترقی کا پاسپورٹ ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر بیوی نے تنک کر کہا: "آپ الٹی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر خواہ مخواہ اپنا دماغ خراب کرتے ہیں۔ میرا کہا مانیے تو فوراً ٹوٹو کو اسکول میں داخل کرا دیجئے۔ ماشاءاللہ اب وہ پانچویں برس میں لگ گیا ہے۔ اسکول جانے لگے گا تو دن بھر کھیل کود کے بہانے جو آوارہ گردی کرتا ہے، سب ختم ہو جائے گی۔" اس نے ایک ہی سانس میں تمام باتیں کہہ ڈالیں۔

میں نے بھی بلا عذر اس کی ہر بات مان لی۔ مسکرا کر کہا: "اب یہی کروں گا۔"

"یہی کروں گا نہیں۔ کل ہی جا کر اسکول میں بٹھا دیجئے۔" وہ اسی تیکھے لہجے میں بولی: "وہ آپ کے

غزنوی صاحب نہ جانے کب دورے سے واپس آئیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی اسکول میں جگہ بھی نہ رہے۔"

میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی "غزنوی صاحب کسی لمبے دورے پر نہیں گئے ہیں، جلد ہی لوٹ آئیں گے۔"

مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی" ذرا سوچئے تو کب غزنوی صاحب آئیں گے۔ کب وہ سفارش کریں گے۔ کب بچہ اسکول میں پڑھنے بیٹھے گا۔ پھر سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ آپ جو دو دو انگریزی اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، ان میں سے کسی ایک میں داخل کرانے میں کیا حرج ہے۔ یہ تو سب سے اچھا ہے کہ بچہ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رہے۔"

بیوی نے ٹھیک ہی کہا میں بیک وقت دو اسکولوں میں پڑھاتا ہوں اور دونوں ہی انگلش میڈیم اسکول ہیں مگر میں اپنے بچے کو ان اسکولوں میں تعلیم دلانا نہیں چاہتا اور اس کا سبب بیوی کو بھی بتانا نہیں چاہتا۔ اس وقت بھی میں نے اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دیا اور صاف بات گول کر گیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ صبح کی شفٹ میں جس اسکول میں پڑھاتا ہوں۔ اس کا نام "گرین وڈ مونٹسوری اسکول" ہے۔ مگر نہ یہاں ہریالی ہے۔ نہ جنگل میں منگل بنانے کا سماں ہے۔ یہ کبھی روئی کی گانٹھیں رکھنے کا گودام تھا۔ ہمارے پرنسپل صاحب بھی کسی زمانے میں روئی کے آڑھتی تھے۔ خدا برا کرے سٹہ بازی کا کہ ان کا تمام کاروبار ایسا چوپٹ ہوا کہ اس گودام پر جھاڑو پھر گئی۔ اس عبرتناک حادثہ نے ان کے دل میں ایسا خوف پیدا کیا کہ سر میں خدمت خلق کا سودا اسمایا۔

اسی خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار ہو کر انھوں نے اپنے گودام میں نئی نسل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اسکول کھول دیا۔ اسکول کے کیبن نما چھوٹے چھوٹے کمروں میں سویرے ہی سویرے لگ بھگ تین سو بچے ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ تمام دن بجلی کے مدھم بلب روشن رہتے ہیں اور اکثر موسم سرما میں بھی پنکھے چلانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسکول کی سب سے دلچسپ شخصیت پرنسپل صاحب ہیں جو مالک ہیں اور منتظم اعلیٰ بھی۔ حالانکہ وہ غلط انگریزی بولتے ہیں۔ نہایت دھڑلے سے بولتے ہیں اور مونٹسوری کے ہجے ہمیشہ غلط لکھتے ہیں مگر ان کا دعویٰ ہے کہ اگر وہ بچوں کو پڑھانا شروع کر دیں تو دور دور تک کوئی اسکول

باقی نہیں رہے گا ۔جگہ چونکہ کم ہے لہٰذا دہ زیادہ بچے اسکول میں داخل نہیں کرنا چاہتے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے درس وتدریس کی جانب ابھی تک سنجیدگی سے توجہ نہیں دی ۔

البتہ وہ ہفتہ میں ایک دوبار ماسٹروں کو سبق ضرور دیتے ہیں ۔ طلبائ کے سامنے ہی وہ اکثر غیظ وغضب کے عالم میں اس طرح گرجتے برستے ہیں کہ کبھی کبھی تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بے چارے کلاس ٹیچر کو چپڑکے بسوں کی لکڑی سے بنی ہوئی کسی میز پر مرغا بنا کر بٹھادیں گے ۔یہ ڈانٹ ڈپٹ وہ اس لیے روا رکھتے ہیں کہ ملازمین کو ہمیشہ تنبیہہ کرتے رہنا چاہیئے، خواہ اسکول کے اساتذہ ہی کیوں نہ ہوں ۔

پرنسپل صاحب کے اس سخت گیر روّیہ کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبار نہایت ڈھٹائی سے اساتذہ کے ساتھ ٹھٹھول بازی کرتے ہیں چنانچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین اس وقت جب کوئی استاد کسی طالب علم کو اس کی نازیبا حرکت پر فہمائش کرنے میں مصروف ہوتا ہے ۔اچانک کلاس روم کے کسی گوشے سے آواز بلند ہوتی ہے" پرنسپل صاحب آرہے ہیں" یہ سنتے ہی استاد کی سٹی گم ہوجاتی ہے ۔ وہ پریشان ہوکر دروازے کی جانب دیکھتا ہے ۔تمام طلبار ٹھٹھا مار کر زور زور سے ہنستے ہیں ۔

سو روپے ماہوار کی مستقل آمدنی اور عزّت دار کہلوانے کا ارمان نہ ہوتا تو اس اسکول میں پڑھانے سے کہیں بہتر تھا کہ میں کباب پراٹھے کی دکان کھول لیتا ۔بیمار اور مردہ مویشیوں کے گوشت کے ساتھ چھچھڑے ملا کر قیمہ بنانا ۔طرح طرح کے تیز مسالے ڈالتا اور ٹھاٹھ سے چٹ پٹے کباب بیچتا اور اپنی مہینہ بھر کی تنخواہ چند روز میں کھری کرلیتا ۔ ویسے اللہ توفیق دے تو اسکول قائم کرنے کا دھندا بھی برُا نہیں ۔اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے ۔عزّت بھی ہے اور کمائی بھی تگڑی ہے ۔

پرنسپل صاحب نے سٹہ بازی میں جتنا لٹایا تھا ،اسے مع سود ، بلکہ سود در سود وصول کر چکے ہیں ۔عالی شان بنگلے میں رہتے ہیں اور کاریں اُڑے اُڑے پھرتے ہیں مگر اسکول کھولنے کے لئے گانٹھ میں رقم ہونا بنیادی شرط ہے ۔کسی نے سچ کہا ہے ، پیسہ ، پیسہ کو کماتا ہے اور وہی اپنے پاس

نہیں۔ ساتھ ہی کاروباری ذہنیت رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ پیداگیری کا فن ہے، جو اللہ کسی کسی کو ودیعت کرتا ہے۔ یہ ہر کس و ناقص کے بس کی بات نہیں۔ میں اس صلاحیت سے قطعی محروم ہوں۔ جب ہی تو گریجویٹ ہونے کے باوجود آئے دن پرنسپل صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا ہوں اور اُف نہیں کرتا۔

دوسرا اسکول، جس میں دوپہر کے بعد پڑھاتا ہوں، شہر کے ایک گنجان بازار میں واقع ہے۔ یہاں رات گئے تک شور وغل رہتا ہے۔ اسکول ایک ایسی دومنزلہ عمارت کے نچلے حصّے میں قائم ہے جس کے ایک گوشہ میں دن چڑھے تک قصائی کی دکان بھی لگتی ہے۔ اس وقت صدر دروازے پر ایک بورڈ آویزاں ہوتا ہے۔ جس پر یہ عبارت درج ہے "یہاں بڑا گوشت فروخت ہوتا ہے۔" دس بارہ بجے تک دکان چلتی ہے، پھر قصائی، گوشت کاٹنے کی چھُری، قیمہ بنانے کا بغدا اور دوسرا سازوسامان ایک کوٹھڑی میں رکھ دیتا ہے۔ عمدہ اور چکنا گوشت اپنے کھانے کے لیے پوٹلی میں باندھ کر چلا جاتا ہے۔

قصائی کی دکانداری ختم ہونے کے بعد صفائی ہوتی ہے، کتوں کو دھتکار کر بھگایا جاتا ہے۔ اور دروازے پر لٹکا ہوا بورڈ پلٹ دیا جاتا ہے۔ اب اس پر انگریزی کے موٹے حروف میں "ہیپی پیراڈائز اسکول" لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکول لگا ہے، کلاسوں میں پڑھائی ہو رہی ہے۔ ناگہاں ہوا کے تیز جھکڑ سے بورڈ پلٹ گیا۔ ہر چند کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے مگر جب ایسا ہوتا ہے تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی گھبرایا ہوا شخص کلاس کے اندر ہکا بکا کھڑا ہے اور ادھر ادھر نظریں دوڑا کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گوشت کہاں فروخت ہوتا ہے۔

سنا ہے رات کو اسکول کی عمارت قماربازوں کا اڈہ بن جاتی ہے، کہنے والے کہتے ہیں کہ اس وقت بھی "ہیپی پیراڈائز اسکول" کا بورڈ دروازے پر لٹکا ہوتا ہے۔ اس اسکول کے مالک، جن کا پرنسپل ہونا لازمی شرط ہے، ذات کے قصائی نہیں ہیں مگر اساتذہ کی کھال ادھیڑنے کے معاملہ میں کسی قصائی سے کم ماہر نہیں۔ وہ مجھے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر تنخواہ کے رجسٹر میں پورے

چارسو درج کرتے ہیں اور رسید پر ٹکٹ لگا کر باقاعدہ دستخط بھی کراتے ہیں۔ موسم گرما کی دو مہینے کی تعطیل شروع ہوتے ہی دوسرے اساتذہ کی طرح میری ملازمت بھی ختم کر دی جاتی ہے حالانکہ وہ تمام طلبا سے تعطیل کی پوری مدّت کی پیشگی فیس وصول کرتے ہیں۔

اسکول جب دوبارہ کھلتا ہے تو ہر ٹیچر کی ملازمت بھی از سر نو شروع ہوتی ہے۔ نہ وہ کبھی تقرری کا پروانہ دیتے ہیں نہ ہی مہنگائی الاؤنس یا کوئی دوسرا مروجہ الاؤنس دیتے ہیں۔ ترقی بھی نہیں دیتے گریڈ بھی نہیں بڑھاتے مگر ہر سال طلبا کی فیس بڑھا دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خوش حالی کا یہ عالم ہے کہ بڑا بیٹا میڈیکل کالج سے ایم، بی، بی، ایس کرنے کے بعد لندن میں ایف آر سی ایس کی تعلیم حاصل کر رہا ہے، دوسرا انجینیئرنگ کے آخری سال میں ہے لیکن امریکہ کی مشہور درسگاہ ایم آئی ٹی میں داخلہ دلانے کے لیے انھوں نے ابھی سے بھاگ دوڑ شروع کر دی ہے۔ ویسے ان کی تمام ہی اولادیں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ دراں حالانکہ وہ خود میٹرک ہیں۔ سنا ہے میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی جعلی ہے۔

یہ بات اس حیثیت سے درست معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ میرٹھ میں تھے تو ثقہ راویوں کے بیان کے مطابق چنگی کے محکمہ میں چپراسی تھے۔ اس وقت ان کا نام منور خان تھا۔ مہاجر بن کر کراچی پہنچے تو سید انور علی ہو گئے اور محکمہ آبکاری میں لوور ڈویژن کلرک بھرتی ہو گئے۔ رشوت خوری کے الزام میں ملازمت سے نکالے گئے تو اتنا کما چکے تھے کہ لارنس روڈ پر کرانہ کی دکان کھول لی مگر اس میں منافع کی شرح کم تھی لہٰذا اسکول کھولا۔

یہ کاروبار ایسا راس آیا کہ دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ نہایت ٹھاٹھ باٹ سے رہتے۔ حکومت میں بھی اوپر تک اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ہر سال اسکول کی جانب سے سالانہ تقریب منعقد کرتے اور ہمیشہ کسی وزیر یا بہت بڑے افسر کی بیگم کو مہمان خصوصی بناتے۔ ایسی تقریبات میں جو سپاسنامہ پیش کرتے اسے لکھنے کا فرض بھی عام طور پر اس خاکسار کو انجام دینا پڑتا۔ سپاسنامہ پڑھتے وقت وہ بار بار اٹکنے کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ اور اصطلاحات کے تلفظ کو کند چھری سے اس بے دردی

کے ساتھ ذبح کرتے کہ تمام اساتذہ کے سر ندامت سے جھک جاتے۔

ایسی صورت میں آپ ہی بتائیے۔ میں اپنے بچے کو کس طرح ان دونوں اسکولوں میں تعلیم دلوا سکتا تھا۔ دیکھتی آنکھوں تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔ پھر ٹوٹو تو میرا اپلوٹی کا بچہ ہے۔ اس کے بارے میں تو یوں بھی بہت حساس ہوں۔ معاف کیجئے گا میں نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ ٹوٹو کا اصل نام محمد علی ہے۔ ویسے انگریزی رسالے "لک" میں ایک خوب صورت ہسپانوی بچہ کی تصویر دیکھ کر ایک عرصہ تک میں اسے لازیرو کہتا رہا۔

اس کا نام محمد علی ماں نے رکھا ہے۔ حالانکہ میری خواہش تھی کہ اسے بلند اختر کہا جائے مگر اس کی ماں نہیں مانی۔ کہتی تھی کہ محمد علی بڑے آدمیوں کا نام ہوتا ہے اور چونکہ ہم دونوں اسے مستقبل میں بڑا آدمی دیکھنا چاہتے تھے لہٰذا مجھے بھی اس کی بات ماننا پڑی۔ یوں بھی ٹوٹو میں عام بچوں سے ہٹ کر بعض ایسی عادتیں پائی جاتی تھیں جو بڑے آدمیوں کے بچپن سے منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کہیں گے اپنی اولاد اور عقل کے بارے میں ہر شخص کو مغالطہ ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ میری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، جو ٹوٹو میں مستقبل کے ایک بڑے آدمی کی علامتیں دیکھ رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میاں بیوی اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ٹوٹو کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ اس سلسلہ میں ہمارے درمیان سخت بحث بھی ہوتی۔ بیوی کہتی کہ وہ ٹوٹو کو ڈاکٹر بنائے گی اور اپنی بات کی تائید میں کہتی: "ڈاکٹروں کی آمدنی کو آپ کیا جانیں۔ کسی روز ڈاکٹر کریمی کے مطب میں جا کر دیکھئے۔ خدا کی قسم نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔" میں مخالفت کرتا تو وہ اپنی رائے اس شرط پر بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاتی۔

"اچھا تو پھر اسے انجنیئرنگ ہی پڑھوا دیجئے۔ خالو فیاض کے پڑوس میں ایک انجنیئر رہتا ہے۔ تنخواہ تو ہزار بارہ سو ہو گی مگر اوپر کی آمدنی اس قدر ہے کہ ایک چھوڑ، دو، دو تو موٹریں ہیں۔ جس شہر میں تبادلہ ہوتا ہے۔ سال بھر کے اندر وہاں اس کی کوٹھی بن کر تیار ہو جاتی ہے۔ انجنیئری میں

بھی کم ٹھاٹھ نہیں مگر میں تو یہی کہوں گی کہ ٹوٹو کو تو ڈاکٹر ہی بنایا جائے۔ آئے دن تو میں بیمار رہتی ہوں۔ وہ ڈاکٹر بن گیا تو میرے ہر مرض کا علاج ہو جائے گا۔ نہ اسپتال جانے کی ضرورت پڑے گی، نہ ڈاکٹروں کو لمبی لمبی فیس دینی پڑے گی۔"

آخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ایک بچّے کو ڈاکٹر، دوسرے کو انجینئر اور سب سے چھوٹے کو پروفیسر بنایا جائے۔ بیوی کو پروفیسری سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ میری تمنا تھی اور اس تمنا کے پس منظر میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ میں تعلیم کے میدان میں مار کھا گیا۔ پھٹیچر اسکولوں کا پھٹیچر ٹیچر ہی رہا۔ پروفیسر نہ بن سکا۔ اپنے بیٹے کو پروفیسر بنا کر میں اپنی کچلی ہوئی خواہشات کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

(۲)

بیوی نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال ٹوٹو کے داخلہ کے بارے میں ہوتا۔ کوئی حیلہ بہانہ کارگر نہ ہوا۔ اس کی بات مجھے ماننی ہی پڑی۔ رات کو منصوبہ بنا، صبح ہوئی تو بیوی سر پر کھڑی تھی۔ زور زور سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا ٹوٹو میاں نہائے دھوئے، آڑی مانگ نکالے، نئی پتلون اور جیکٹ ڈاٹے اسکول جانے کے لیے چاق و چوبند کھڑے تھے۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ خود میں نے بھی اسی اہتمام سے تیاری کی۔ جب میں ٹوٹو کے ہمراہ گھر سے روانہ ہوا تو اس کی ماں کی خوشی کا عالم نہ پوچھئے۔ بات بات پر باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

راستہ میں ایک بار خیال بھی آیا کہ غزنوی صاحب دورے سے واپس آجاتے تو اچھا تھا۔ وہ بارسوخ آدمی ہیں۔ ان کی کوشش سے کونونٹ میں داخلہ ملنا آسان ہو جاتا مگر یہ سوچ کر دل مضبوط کیا کہ آخر میں بھی تو اسکول ٹیچر ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو پیشہ کا لحاظ رکھا ہی جائے گا۔

سینٹ پیٹر اسکول کا راستہ، میرے گھر سے بس کے ذریعہ مشکل سے پندرہ منٹ کا

ہو گا۔ میں جس وقت وہاں پہنچا، اسکول لگ چکا تھا۔ پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے وسیع میدان تھا۔ اس کے تین طرف اسکول کی دو منزلہ عمارت تھی۔ میدان کے ایک حصے میں بڑا خوشنما باغیچہ تھا۔ اس میں چھوٹے بچّوں کے لیے جھولوں کے علاوہ کھیل کود کے طرح طرح کے لوازمات تھے۔ صاف ستھرا ماحول تھا۔ ضرورت کی ہر چیز قاعدے قرینے سے اپنی جگہ موجود تھی۔

پرنسپل کے دفتر کے سامنے پہنچا۔ چپراسی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے چپراسی سے کاغذ کی چٹ لی۔ سوچا اس وقت اپنے نام سے فائدہ اٹھایا جائے چنانچہ سید محمد باقر کے بجائے میں نے ایس اے بیکر، ٹیچر گرین ووڈ اسکول، لکھ کر چٹ اندر بھیجی۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ذرا ہی دیر بعد پرنسپل نے اندر بلایا۔ وہ ادھیڑ عمر کا پادری تھا۔ خوب صورت بھوری داڑھی، سفید براق لباس، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ سینہ پر لٹکتی ہوئی چمکتی دمکتی صلیب۔ بڑا پُروقار آدمی تھا۔

وہ خندہ پیشانی سے ملا۔ بیٹھنے کو کرسی پیش کی۔ مسکرا کر انگریزی میں پوچھا: "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ تھا۔

"اس بچّے کو آپ کے اسکول میں داخل کروانا چاہتا ہوں۔" میں نے قریب کھڑے ہوئے ٹوٹو کی جانب اشارہ کیا۔

پرنسپل کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی "میرا خیال ہے غالباً آپ نے دروازے کے باہر لگا ہوا بورڈ نہیں دیکھا۔"

مجھے یاد آیا کہ دروازے پر ایک بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر یہ عبارت درج تھی۔ "تمام کلاسوں میں داخلہ بند ہو چکا ہے۔" لیکن پرنسپل سے ملاقات کرنے سے قبل میں نے اس بورڈ کی اہمیت جس طرح نظر انداز کی تھی، اسی طرح اس کی بات سن کر بھی کی۔ مسکرایا اور لہجہ میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا "بورڈ تو میں نے دیکھا ہے لیکن گرین ووڈ اسکول میں . . . ."

اس نے میری پوری بات بھی نہ سنی، ترش روی سے بولا "یہ بورڈ دروازے پر صرف اس لیے لگایا گیا ہے تاکہ لوگ نہ اپنا وقت برباد کریں نہ میرا۔"

میں نے ڈھٹائی اختیار کرنے کی کوشش کی، بولنے کے لیے منہ کھولا مگر اس نے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ سرخی بن کر دوڑنے لگی۔ اس نے مجھے تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔ میرا رویہ اسے نہایت شاق گزرا تھا۔ فوراً چپراسی کو بلانے کے لیے زور سے گھنٹی بجائی۔ میں گھبرا کر جھٹ کھڑا ہو گیا۔ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں چپراسی کو بلا کر کمرے سے باہر نہ نکلوا دے۔ سراسیمگی کے عالم میں پرنسپل سے ہاتھ بھی نہ ملا سکا معذرت بھی نہ کی۔ مڑا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ اسی وقت چپراسی بھی اندر داخل ہوا، اس زور سے چپراسی سے ٹکرایا کہ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

اسکول کے پھاٹک سے باہر نکلا تو اس قدر کوفت تھی کہ دل بیٹھا جاتا تھا۔ ٹوٹو ساتھ ساتھ تھا۔ وہ بھی حیران و پریشان نظر آتا تھا۔ نہ اس نے بات کی نہ میں نے۔ چپ چاپ گھر کی جانب چلا مگر یہ فکر دامنگیر تھی کہ بیوی کے سامنے کیا عذر پیش کیا جائے۔

خدا خدا کر کے راستہ کٹا۔ گھر میں داخل ہوا۔ بیوی بے چینی سے منتظر تھی۔ میں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صاف جھوٹ بولا "ایک ہفتہ بعد بلایا ہے۔"

اس نے شاید میرے چہرے کی پریشانی کو تاڑ لیا تھا۔ جھٹ اپنے شبہ کا اظہار کیا "صرف بلایا ہی بلایا ہے۔ داخلہ بھی ملے گا کہ نہیں؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ بیوی کو باور کرایا "داخلہ کیوں نہیں ملے گا۔ آخر بلایا کس لیے ہے۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ اسی پریشانی میں ڈوبا اسکول پہنچا۔ دوسرے اساتذہ سے تذکرہ کیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ڈائریکٹر تعلیمات کے دفتر میں کسی سے جان پہچان پیدا کرو۔ کسی نے بعض بڑے افسروں کا نام لیا۔ ان سے ملنے پر زور دیا کسی نے سیاسی لیڈروں کے ذریعہ سفارش

پہنچانے کا نسخہ بتایا۔ سب نے ایسے افراد کا ذکر کیا جن کے پاس پہنچنے کے لیے علیحدہ رسائی پیدا کرنے کی ضرورت تھی اور وہ میرے بس میں نہ تھی۔

اسی پریشانی میں غلطاں و پیچاں تھا کہ ایک روز والد کے پرانے شناسا محمد نواز مل گئے۔ وہ فوج میں صوبیدار رہ چکے تھے۔ اب پنشن لیتے تھے۔ دیکھتے ہی ہمدردی سے بولے "کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ برخوردار بات کیا ہے؟" میں نے حال دل بیان کیا۔ اپنی الجھن بتائی۔

وہ بے نیازی سے بولے "تم اس عیسائیوں والے اسکول کا ذکر تو نہیں کر رہے ہو، جو صدر میں ہے۔"

میں نے جواب دیا "جی ہاں اسی اسکول میں بچّہ کو داخل کرانے کا خواہشمند ہوں۔"

نہایت اطمینان سے گویا ہوئے "وہاں تو کام بن سکتا ہے، ابھی چلو۔ نیک کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔"

میں گھبرا گیا۔ سوچا، ان سے تو بات کر کے مصیبت مول لے لی۔ وہ تو بس سر ہو گئے۔ اصرار کر کے اسی وقت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ فوجی وردی پہنی۔ سینہ پہ خدا معلوم کتنی قسم کے فیتے اور تمغے سجائے سرٹیفیکیٹوں کا پلندہ سنبھالا، باہر نکلے، میرے گھر کی جانب چلے۔ میں ساتھ ساتھ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح ان سے پیچھا چھڑاؤں۔ وہ سینہ تانے گردن اٹھائے نہایت آن بان سے چل رہے تھے اور بہت مطمئن نظر آ رہے تھے۔

ہم دونوں گھر پہنچے۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ ٹوٹو کو ساتھ لیا اور سینٹ پیٹر اسکول پہنچ گئے۔ مجھے پرنسپل کے روبرو جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی مگر محمد نواز بضد تھے کہ میں بھی اندر چلوں۔ چپراسی نے چٹ بڑھائی۔ انھوں نے اس کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ ٹوٹو بھی ہمراہ تھا۔ صوبیدار صاحب نے کھٹاک سے جوتوں کی دونوں ایڑیاں جوڑیں۔ ایک ہاتھ اٹھا کر خالص فوجی انداز سے سلیوٹ مارا۔ پرنسپل نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مگر صوبیدار صاحب بدستور کھڑے رہے۔ انھوں نے پلٹ کر ٹوٹو کی جانب دیکھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کیا۔ بلا کسی تمہید کے مدعا بیان کیا: "صاحب، اس بچے کو آپ کی سپردگی میں دینے لایا ہوں۔"

صوبیدار صاحب تمغوں سے سجا ہوا سینہ اٹھائے اٹنشن کھڑے تھے۔ میں ان کی آڑ میں اس طرح سکڑا سکڑایا کھڑا تھا کہ پرنسپل کی نظر نہ پڑے اور مجھے ایک بار پھر خفت اٹھانا نہ پڑے۔ میں گومگو کے عالم میں تھا۔ سوچ رہا تھا۔ دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

پرنسپل گم صم بیٹھا تھا۔ گردن جھکائے کسی گہری فکر میں غرق تھا۔ صوبیدار صاحب نے اسے خاموش دیکھا تو زیادہ دیر ضبط نہ کر سکے۔ کڑک کر بولے: "صاحب، ہم نے زندگی بھر ہز مجسٹی گورنمنٹ کی خدمت کی ہے۔ اس کے ہمیشہ وفادار رہے ہیں۔ سرکار کے حکم پر ہر قربانی دی۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑائیاں لڑی ہیں۔" انھوں نے سینے پر سجے ہوئے چمکتے دمکتے تمغوں کی جانب انگلی سے اشارہ کیا: "یہ بہادری پر ملے ہیں۔"

"ٹیک اے، ٹیک اے"، پرنسپل نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

صوبیدار صاحب نے اسی جوش و خروش سے کہا: "پچھلی جنگ عظیم میں میرے دو بھائی برما میں بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔" انھوں نے سرٹیفکیٹوں کا پلندہ پرنسپل کے سامنے ڈال دیا: "یہ سرٹیفکیٹ دیکھئے۔ میں نے بھی ہز مجسٹی گورنمنٹ کے لیے جاپانیوں کے خلاف جنگ کی۔ زخمی بھی ہوا۔"

پرنسپل مسکرا کر بولا: "ول، ول صوبیدار، ٹُم گھبراؤ نہیں۔ ہم ٹمارے بچّے کے لیے ضرور کچھ کریں گے۔"

"صاحب اسے تو آج ہی داخلہ ملنا چاہیئے اور ابھی ملنا چاہیئے۔" صوبیدار صاحب اڑ گئے۔ انھوں نے پتلون چڑھائی۔ گھٹنے کے پاس زخم کا نشان دکھایا: "دیکھئے یہ گولی کے زخم کا نشان ہے، جو تریپولی کے محاذ پر ترک فوجوں سے لڑتے ہوئے لگی تھی۔ یہ پہلی جنگ عظیم

کی بات ہے۔ میں اس قدر زخمی ہوا تھا کہ دو مہینے اسپتال میں رہا۔ میری رجمنٹ کی کمان کیپٹن اکبر خان کر رہے تھے جو بعد میں نواب سر اکبر خان آف ہوتی کہلائے۔ انھوں نے مجھے بہادری کا سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا۔" صوبیدار صاحب نے اپنے کاغذات کے پلندے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ "ان سرٹیفکیٹوں میں سب کچھ لکھا ہے۔ انھیں ذرا پڑھ کر تو دیکھیے۔ آپ کو ہماری وفاداری کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔"

پرنسپل نے سرٹیفکیٹ الٹ پلٹ کر سرسری نظر سے دیکھے۔ گردن اٹھائی۔ صوبیدار صاحب کو مخاطب کیا: "ول صوبیدار، تمہارے بچّے کو ضرور ایڈمیشن ملے گا۔"

صوبیدار محمد نواز نے مڑ کر میری جانب داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ان کی خضاب لگی مونچھیں اس وقت زیادہ ہی بارعب نظر آ رہی تھیں۔ گردن بھی تنی ہوئی تھی۔ میں ان کی شخصیت سے سخت مرعوب ہوا۔ پرنسپل نے نہ میری طرف توجہ کی نہ اسے یہ یاد آیا کہ میں اس کے پاس پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس نے گھنٹی بجائی، کلرک کو بلایا۔ ہدایت جاری کی کہ ٹوٹو کو کے۔ جی میں داخل کر لیا جائے۔

میں کلرک کے ہمراہ اس کے دفتر میں گیا۔ اس نے فارم داخلہ دیا۔ میں نے اسے پُر کیا مگر جب اس نے فیس بتائی تو میں چکرا گیا۔ تیس روپے ٹیوشن فیس، پچاس روپے ماہانہ بس کا کرایہ، پندرہ روپے فیس داخلہ۔ اس کے علاوہ کھیل کود، یونیفارم اور اسی قسم کے دیگر اخراجات تھے۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو روپے کا نسخہ تھا۔ اسی وقت گھر گیا۔ روپے لایا اور اللہ کا نام لے کر ٹوٹو کو اسکول میں داخل کرا دیا۔

صوبیدار صاحب کی وردی اور تمغوں کے سامنے نہ میرا گریجویٹ ہونا کام آیا، نہ ڈبل ٹیچری۔ ٹوٹو کا داخلہ اس قدر آسانی سے ہو گیا کہ میں ششدر رہ گیا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر با اثر اور کام کے آدمی ہیں۔

اب صبح ہی صبح گھر کے سامنے سینٹ پیٹر اسکول کی بس ہارن بجاتی۔ پڑوسیوں پر بڑا

رعب پڑتا۔ ٹوٹو میاں کندھے پر خوبصورت بستہ لٹکائے، جھومتے جھامتے گھر سے نکلنے اور بس میں سوار ہو کر روانہ ہو جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی اسے اسکول جاتے دیکھتے تو خوشی سے سیروں خون بڑھ جاتا۔ دروازے سے لگے اسکول کی بس کو جاتے ہوئے دور تک دیکھتے رہتے۔

دوسرا مہینہ شروع ہوا تو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ٹوٹو کی تعلیم کے اسّی روپے ماہوار یعنی تیس روپے ٹیوشن فیس اور پچاس روپے بس کا کرایہ، گھر کے اخراجات کی کس مد سے نکال کر مہیا کئے جائیں۔ نپی تلی آمدنی تھی، جتنی ماہانہ یافت تھی، خرچ اس سے کچھ زیادہ ہی تھا کسی نہ کسی طرح غریبا مئو گزر بسر ہو رہی تھی۔ سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بچت کا یہ طریقہ نکالا۔ روزانہ گھر سے اسکول جاتے ہوئے دو کے بجائے ایک روپیہ جیب میں ڈال کر نکلتا۔ صبح بس سے جاتا۔ اس لئے کہ وقت پر اسکول پہنچنا ضروری تھا۔ تاخیر سے پہنچتا تو گرین وڈ مونٹیسوری اسکول کے پرنسپل آدھے دن کی تنخواہ کاٹ لیتے۔ ہیپی پیراڈائز اسکول بھی بس ہی سے جاتا۔ وہاں بھی مقررہ وقت پر پہنچنے کی سخت پابندی تھی۔ البتہ واپسی پر پیدل گھر آتا۔ وقت اپنا تھا، ٹانگیں اپنی تھیں، نہ کسی کا ڈر نہ خوف۔

سگرٹوں کی تعداد بھی کم دی اور سستے برانڈ کے سگریٹ پینے لگا۔ کرتا بھی کیا ایک روپیہ لو سیہ جیب خرچ میں سستی اور گھٹیا ہی سگریٹ پی سکتا تھا۔ صرفہ کرنے کا دوسرا نسخہ یہ آزمایا کہ صبح جو عورت برتن دھونے آتی تھی، اسے علیحدہ کر دیا حالانکہ بیوی نے احتجاج کیا، اپنی مجبوری کا رونا رویا، کہنے لگی۔ "میں ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالتی ہوں تو چھوٹے بچے کا سینہ جکڑ جاتا ہے۔ نمونیہ ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ جتنی بچت ہوگی اس سے زیادہ دوا دارو پر خرچ ہو جائے گا۔"

لہذا یہ ذمہ داری مجھے اپنے سر لینا پڑی مگر اس کفایت شعاری سے بھی کام نہ چلا۔ نظر کپڑوں کی دھلائی کی طرف گئی۔ طے کیا گیا کہ صرف بڑے کپڑے دھوبی کو دیئے جائیں۔ بچوں کے کپڑے گھر ہی پر دھوئے جائیں۔ کچھ اس طرح بچت ہوئی۔ گھی ہر مہینے تین سیر خرچ ہوتا تھا، دو سیر کر دیا گیا۔ دودھ سیر بھر کے بجائے تین پاؤ آنے لگا۔ گھر میں سو اور ساٹھ کینڈل پاور کے جتنے بلب لگے تھے سب اتار لئے گئے اور پچیس، چالیس

کینڈل پاور کے بلب لگا دیئے گئے۔ اس طرح گھر کا بجٹ از سرِ نو تیار ہوا اور ٹوٹو کی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کی سبیل نکلی۔

ٹوٹو میاں روز اجلی یونیفارم پہنے، آڑی مانگ نکالے، ٹھاٹھ سے اسکول جاتے۔ میں تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر رات کے جھوٹے برتن صاف کرتا، بچوں کے کپڑے دھوتا، مزے سے بگلہ مارکہ سگریٹ پیتا اور دوسروں کو تلقین کرتا کہ یہی سگریٹ پیا کرو۔ کم خرچ بالانشیں۔ نہ گلا پکڑتا ہے نہ کش لگاتے وقت ٹھسکا لگتا ہے۔

ایک سال اسی طرح لشتم پشتم گزر گیا۔ نہ پوچھیے اس عرصہ میں کیا کیا جتن کرنا پڑے۔ کس کس طرح اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر ٹوٹو کی تعلیم کے اخراجات پورے کئے۔ اسّی روپے تو ہر مہینے بہر حال دینے ہی پڑتے۔ اس کے علاوہ کبھی پک نک کا چندہ جاتا، کبھی میجک شو کا، کبھی سالانہ تقریب کا، کبھی اِس کا کبھی اُس کا، آئے دن کوئی نہ کوئی چکر چلتا۔ طرح طرح کے مطالبے ہوتے اور ہر مطالبہ پورا بھی کرنا پڑتا۔

دوسرے سال ٹوٹو کا چھوٹا بھائی فی فی بھی بقول میری بیوی کے پانچویں سال میں لگ گیا۔ اسے بھی اسکول میں داخل کرانے کا سوال سامنے آیا۔ ایک بار پھر صوبیدار صاحب کا دامن پکڑا۔ ان کے ہمراہ سینٹ پیٹر اسکول کے پرنسپل کے پاس پہنچا۔ صوبیدار صاحب خاکی وردی پہنے، تمغوں سے سینہ سجائے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ فوجی بوٹوں کی ایڑیاں ایک دوسرے سے ملائیں، اٹینشن ہوئے، ایک ہاتھ سے کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور کھٹاک سے فی فی کو بھی داخلہ مل گیا۔ میں نے اسکول سے باہر نکلتے ہی فرطِ عقیدت سے صوبیدار صاحب کا ہاتھ چوم لیا۔

اب میں سگریٹ کے بجائے چاند مارکہ بیڑی پینے لگا تھا۔ اسکول بھی پیدل جاتا۔ واپس تو سال بھر سے پیدل ہی آتا تھا اور اس کا عادی بھی ہو چکا تھا۔ گوشت ہفتہ میں صرف ایک بار آتا۔ دالوں اور سبزیوں پر ہی گزارہ ہوتا۔ بناسپتی گھی کے بجائے سرسوں کا تیل استعمال ہونے لگا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کر دیا گیا، دودھ آدھ سیر ہی آتا۔ پانی کی ملاوٹ کے باوجود اس میں اور پانی ڈال کر مقدار پوری کی جاتی۔ بجلی کے بلب صرف مہمانوں کی آمد پر روشن کئے جاتے۔ ورنہ اپنا کام تو لالٹین سے چل جاتا تھا۔ مہینہ میں ایک بار، بیوی بچوں کے ساتھ کوئی فلم ضرور دیکھتا تھا اس سے بھی توبہ کرلی۔

کرنا بھی کیا۔ ٹوٹو کے ساتھ فی فی کی فیس اور طرح طرح کے چندوں کی صورت میں لگ بھگ دو سو روپے ماہانہ پابندی سے ادا کرنا پڑتا۔ ٹوٹو اب کے جی سے پرائمری میں آگیا تھا۔ لہٰذا اس کی فیس میں اضافہ ہوگیا۔

مگر میری تنخواہ میں صرف دس روپے اضافہ ہوا۔ وہ بھی ہیپی پیراڈائز اسکول کے مالک یا پرنسپل نے اپنے منجھلے بیٹے کے انجینئر بن جانے کی خوشی میں کیا تھا۔

البتہ تیسرے بچے کوکب کا اسکول میں داخلہ مجھے گراں نہیں گزرا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ چونکہ تینوں بھائی ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ لہٰذا ایک کی فیس معاف ہوگئی۔ اس میں بھی صوبیدار صاحب کی کوشش کو بڑا دخل تھا۔ کوکب کو داخل کرانے میں بھی انھوں نے دست گیری کی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میرے لئے تو وہ رحمت کا فرشتہ تھے۔ ان کی وردی میں عجیب تاثیر تھی۔ ادھر انھوں نے اٹینشن ہوکر پرنسپل کے سامنے سیلوٹ مارا، اُدھر غیب سے آواز آئی۔ کھل جا سم، سم! سینٹ پیٹر اسکول کا دروازہ اس طرح پاٹوں پاٹ کھل جاتا کہ میرا ہر بچہ بے دھڑک اندر داخل ہوجاتا۔ کسی میں اتنی مجال نہ تھی کہ اسے داخلہ دینے اور تعلیم حاصل کرنے سے روکے۔

(۳)

میرے تینوں بچے ذہین اور ہونہار تھے۔ ہر سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے اور نیچے سے اوپر کے درجوں میں پہنچتے رہے۔ ان کی فیسیں اور چندے بھی بڑھ کر اوپر اور اوپر پہنچتے رہے۔ مگر میں ترقی کر کے اوپر نہ جا سکا۔ جہاں تھا وہیں جما رہا۔ اخراجات بڑھے، مہنگائی بڑھی اور تیزی سے بڑھی اور میری تنخواہ اس طرح بڑھی، جیسے آٹے میں نمک۔ لہٰذا دودھ بند کر دیا، گھی بند کر دیا، گوشت بند کر دیا۔ بیڑی پینا بھی چھوڑ دی اور صرف حقہ گڑگڑانے لگا۔ رکشا اور بس کا سفر بھی چھوٹ گیا۔ میں سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ ملنے جلنے والوں کو نصیحت کرتا، پیدل چلو، جان بناؤ اور ڈاکٹروں کے چکر سے محفوظ رہو۔

نہ بیماری کا ڈر، نہ علاج معالجہ کی فکر۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ مزید بچت کے لئے کھانا دو وقت کے بجائے ایک وقت کر دیا جائے۔ اسی اثناء میں مجھے ایک نائٹ اسکول میں ملازمت مل گئی۔ ٹائپنگ کا کورس میں پہلے ہی مکمل کر چکا تھا اور ایک سکنڈ ہینڈ ٹائپ رائٹر بھی خرید لی تھی۔ چنانچہ نائٹ اسکول سے فارغ ہوتا تو آدھی رات تک بعض وکیلوں کی قانونی دستاویزات ٹائپ کرنے کا کام انجام دیتا۔ سویرے ہی سویرے گھر سے نکلتا، رات کے گیارہ بجے واپس آتا اور بارہ بجے تک بلکہ اکثر و بیشتر رات کے پچھلے پہر تک ٹائپ رائٹر پر کھٹ پٹ کرتا رہتا۔

لیکن یہ محنتِ شاقہ ذرا نہ کھلتی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرے "تینوں بچے اعلیٰ اور معیاری اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کا مستقبل روشن تھا اور میں ان کے روشن مستقبل میں اپنا مستقبل روشن اور تابناک دیکھ رہا تھا۔ اب ان سے میری ملاقات اتوار کے اتوار ہوتی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جس وقت میں گھر سے نکلتا وہ سوئے ہوتے اور جب واپس آتا تو وہ اپنے بستروں پر گہری نیند سو چکے ہوتے۔

آمدنی میری اب اتنی ہو گئی تھی کہ کسی نہ کسی طور گزر بسر ہو رہی تھی، نہ کسی کا قرض تھا، نہ اودھار۔ مگر مسلسل شب بیداری کے باعث ایک بری عادت یہ پڑ گئی تھی کہ کلاس میں اکثر کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عادت ہیپی پیراڈائز اسکول سے پڑی تھی۔ اسکول سے جب جی چاہتا اٹھ کر چلا جاتا۔ بغیر درخواست دیئے چھٹی کرتا، طبیعت راغب ہوتی تو سبق پڑھا دیتا۔ ورنہ میز پہ ٹانگیں پھیلائیں، آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ اسکول کے پرنسپل سید انور علی، جو منتظم اعلیٰ بھی تھے۔ دوسرے ہی بکھیڑوں میں الجھے ہوئے تھے۔ بہت کم اسکول آتے اور جب آتے تو گھڑی دو گھڑی سے زیادہ اپنے دفتر میں نہ ٹھہرتے، کلاسوں کی طرف رخ ہی نہ کرتے۔

ان دنوں وہ سخت مصروف نظر آتے۔ اس مصروفیت کی نوعیت یہ تھی کہ انھیں اچانک علامہ اقبال کے افکار سے عشق ہو گیا اور اس کا مظاہرہ پہلے پہل اس طرح دیکھنے میں آیا کہ ایک روز انہوں نے تمام اساتذہ کی میٹنگ بلائی، ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر فرمائی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ علامہ اقبال نے اپنی تعلیمات اور اپنے افکار سے کس طرح اسلام کو سربلند کیا۔ اپنی شاعری سے برصغیر کے مسلمانوں کو کیونکر

خواب غفلت سے بیدار کیا۔ انھیں وہ عزم اور حوصلہ دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے پاکستان کی صورت میں موجود ہے۔ پرنسپل صاحب نے اساتذہ پر زور دیا کہ وہ نئی نسل کو اقبال کے افکار سے اس طرح لیس کریں کہ آگے چل کر وہ ملک و قوم کی خدمت کا فرض خلوص اور ذمہ داری سے انجام دیں۔

ان کے ارشادات پر دوسرے ہی روز سے عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ یہ نہایت روح پرور منظر تھا، ہیپی پیراڈائز کے طلبا جھوم جھوم کر نہایت والہانہ انداز میں اقبال کی مشہور نظم ''دعا'' ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ پھر تو یہ معمول ہو گیا کہ ہر صبح کورس میں یہ نظم گائی جاتی حالانکہ انگلش میڈیم اسکول کے لئے جہاں ''بابا، بابا بلیک شیپ''، ''ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار'' یا اسی قبیل کی دوسری انگریزی نظموں کا رواج تھا، یہ قطعی نئی بات تھی مگر پرنسپل صاحب مطمئن تھے اور نہایت فخر سے فرماتے تھے کہ انھوں نے ایک صحتمند اسلامی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔

علامہ اقبال کے ساتھ ان کا والہانہ عشق اس قدر بڑھا کہ یوم اقبال پر نہایت اہتمام سے ایک جلسہ منعقد کیا۔ شمالی ناظم آباد کے ایک کھلے میدان میں شاندار پنڈال لگایا گیا۔ جلسہ کے لئے مہمانِ خصوصی کے طور پر کمشنر کو بلایا گیا۔ انھیں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ حسب معمول اس ناچیز نے لکھا۔ پرنسپل صاحب کی ہدایات پر اس میں بار بار ترمیم کی گئی۔ جلسہ کی کارروائی تلاوتِ کلام پاک سے شروع ہوئی۔ پرنسپل صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا۔ جس میں علامہ اقبال کے افکار اور ان کی تعلیمات کو عوام میں پھیلانے اور فروغ دینے کے لئے ''اقبال میموریل لائبریری'' قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ لائبریری کے قیام کے لئے کمشنر سے جگہ مہیا کرنے کی اپیل کی گئی۔ جس میدان میں جلسہ منعقد ہوا تھا وہ دراصل تین ہزار سے بھی زیادہ مربع گز پر مشتمل ایک کمیونٹی پلاٹ تھا۔ یہ پلاٹ پبلک لائبریری کے لئے مختص تھا۔ سپاسنامہ میں کمشنر صاحب بہادر کی خدمات جلیلہ کا ایسا شاندار قصیدہ تھا کہ وہ پھڑک اٹھے۔ دربار داری اور خوشامد کے عادی افسر تھے۔ سپاسنامہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت پلاٹ کے الاٹمنٹ کے احکامات جاری کر دیئے۔

''انجمن محبانِ اقبال'' کے نام سے پہلے ہی ایک تنظیم قائم ہو چکی تھی۔ جلسہ بھی اسی کے زیر اہتمام ہوا تھا۔ انجمن کے تاحیات صدر ہیپی پیراڈائز اسکول کے پرنسپل سید انور علی تھے۔ ارکان میں ان کے چار

بیٹے، دو بھتیجے اور ایک بھانجے شامل تھے۔ سیّد انور علی جوڑ توڑ والے آدمی تھے۔ کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی یعنی کے ڈی اے کے حکام کو کھلا پلا کر وہ پہلے ہی رام کر چکے تھے لہٰذا جلد ہی ضروری خانہ پُری مکمل ہوگئی۔ اور پلاٹ کا الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ الاٹمنٹ ملتے ہی چار دیواری بنا دی گئی اور "اقبال میموریل لائبریری" کا بورڈ بھی آویزاں کر دیا گیا۔ سیّد انور علی نے لائبریری کی عمارت کی تعمیر کے لئے بھاگ دوڑ کی۔ سرکاری گرانٹ کے علاوہ مخیّر صنعت کاروں اور دوسرے اہل ثروت سے چندہ حاصل کیا۔ اس فنڈ سے عمارت کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ان دنوں وہ عمارت کی تعمیر میں اس قدر انہماک اور سرگرمی سے مصروف تھے کہ ہیپی پیراڈائز اسکول کی طرف توجہ دینے کے لئے بھی ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

ذکر تھا میری اس بُری عادت کا، جس کے باعث میں اکثر کلاس میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا تھا۔ گرین وڈ کے پرنسپل کی خصوصیات تو میں بیان ہی کر چکا ہوں۔ انھوں نے کئی بار مجھے غنودگی کے عالم میں دیکھ لیا۔ سخت برہم ہوئے۔ طلبا کے سامنے بے عزت بھی کیا۔ لیکن ایک روز تو انھوں نے حد کر دی۔ میں طلبا کو سبق دے کر حسب عادت کرسی پر سو گیا۔ اسی اثناء میں پرنسپل صاحب وارد ہوئے۔ بنیادی طور پر تو وہ ردّی کے آڑھتی ہی تھے۔ غصّہ ضبط نہ کر سکے۔ کان پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ حواس باختہ ہو کر آنکھ کھولی۔ دیکھا، کلاس کے تمام طلباء قہقہے لگا رہے تھے اور پرنسپل صاحب فرشتۂ اجل کی مانند سر پر کھڑے نہایت قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

ڈپٹ کر بولے۔ "اس دفعہ تو میں نے چھوڑ دیا۔ آئندہ کلاس میں سوتے ہوئے پایا تو اسی روز سے برخاست کر دوں گا۔"

وہ ڈانٹ پھٹکار کر چلے گئے۔ بڑی کرکری ہوئی۔ طلبا سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر نہ میری شب بیداری میں فرق آیا اور نہ نیند نے مجھ پر رحم کھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ بعد کلاس میں سوتے ہوئے پھر پکڑا گیا۔ پرنسپل صاحب اس قدر غضب ناک ہوئے کہ مجھے زور سے دروازے کی جانب دھکا دیا۔ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔ اسی وقت تنخواہ کی رقم ہاتھ میں رکھ کر اسکول سے چلتا کیا۔

گرین وڈ اسکول کی ملازمت ختم ہو جانے کا مجھے شدید صدمہ ہوا۔ سو روپے ماہانہ آمدنی کا یک لخت بند ہو جانا معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں ہیپی پیرا ڈائز اسکول کے مالک اور پرنسپل کی جانب نظریں اٹھیں، چاہا کہ ان سے ملاقات حاصل کی جائے۔ اپنی پریشان حالی بیان کی جائے اور اس کی بنیاد پر تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی جائے۔ ان دنوں وہ خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار تھے اور علامہ اقبال کی تعلیمات سے شدت کے ساتھ متاثر تھے۔ لہذا توقع پیدا ہوئی کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ مدد فرمائیں گے۔

یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ وہ اسکول میں بہت کم آتے تھے مگر جتنی بار آئے، ہر بار میں نے ان سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس قدر عجلت میں آتے اور اتنے کم وقت کے لئے آتے کہ ملاقات بھی ہوتی تو بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔ آخر ایک روز ہمت کی۔ اقبال میموریل لائبریری پہنچا۔ سید انور علی اس وقت اپنے دفتر میں تھے اور تنہا بھی تھے۔ لائبریری کی پہلی منزل کی تعمیر کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ بہت بڑی عمارت تھی۔ بارہ کمرے تھے۔ کشادہ اور طویل ہال تھا۔ برآمدے تھے۔ راہداریاں تھیں، وسیع لان تھا غرضیکہ سب ہی کچھ تھا۔

انور علی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مسکرا کر پوچھا "آج ادھر کیسے نکل آئے؟"

"لائبریری دیکھنے آیا تھا۔" میں نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے عرض کیا۔ "بہت شاندار لائبریری ہے۔ واقعی آپ نے بہت بڑا کام کیا۔"

خوش ہو کر بولے۔ "میں نے اس کے لئے کتنی جانفشانی کی ہے، اس کے بارے میں اپنی زبان سے کیا بتاؤں، سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔" وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ٹھنڈی سانس بھری۔ "چاہتا ہوں زندگی میں ملک و قوم کیلئے ایسا کام کر جاؤں کہ آنے والی نسلوں کی قسمت بدل جائے۔"

میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "بہت قابل قدر جذبہ ہے۔ لوگ تو صرف باتیں کرتے ہیں، آپ نے کرکے دکھا دیا۔"

کہنے لگے۔ "علامہ اقبال کا پاکستان پر احسان ہے۔ اسے ہم ان کی ایسی ہی یادگاروں کے ذریعہ

چکا سکتے ہیں۔"

وہ اقبالیات پہ باقاعدہ درس دینے لگے اور میں کان دبائے سنتا رہا۔ ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ انھوں نے علامہ اقبال کے بارے میں دو چار کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ کچھ اشعار بھی ازبر کر لئے تھے جنھیں وہ اس طرح سناتے کہ مفہوم خبط ہو جاتا۔ نظم پر نثر کا گمان ہوتا۔ فلسفہ خودی کی انھوں نے ایسی توجیہہ اور تشریح کی کہ وہ اقبال کی فکر سے بھی زیادہ بلندی پر پرواز کرنے لگے ۔

ان کا جوش و خروش ذرا ٹھنڈا پڑا تو میں حرفِ مطلب پر آیا۔ "آپ کو شاید علم نہیں۔ مجھے گرین وڈ اسکول سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔"

اظہار ہمدردی کے بجائے چہک کر بولے۔" یہ بھی اچھا ہی ہوا، تم کو اس واہیات اسکول سے نجات مل گئی۔ ہاں وہ بھی کوئی اسکول ہے اور اس کا مالک تو صورت سے کان میلیا نظر آتا ہے۔ اس قدر اَن پڑھ اور جاہل ہے کہ اسکول چلانے کے بجائے اسے گدھا گاڑی چلانی چاہیئے۔"

"درست فرمایا آپ نے۔" میں نے ان کی تائید کی۔" میں تو بدرجہ مجبوری وہاں پڑھا رہا تھا۔ مگر اس اسکول سے علیحدہ ہونے کے بعد میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہوں، گزر بسر مشکل ہو گئی ہے۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔" انھوں نے نصیحت فرمائی اور میں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کھل کر بات کی۔" میں اس لئے بھی حاضر ہوا تھا کہ آپ سے درخواست کروں گا کہ میری تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے۔ آپ نے وعدہ بھی کیا تھا۔" میں نے لہجے میں عاجزی اور رقت پیدا کی۔ "آپ سے بتا نہیں سکتا کس قدر پریشانی میں پڑ گیا ہوں۔"

"فی الحال تو بھئی میں کچھ نہیں کر سکتا۔" انھوں نے ٹکا سا جواب دیا۔

میں اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

مجھے خاموش اور مضمحل دیکھ کر انھوں نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ کسی قدر نرم لہجے میں بولے۔" کچھ دن صبر کر لو۔ پھر نہ صرف تمھاری تنخواہ بڑھا دوں گا بلکہ اور بھی بہت کچھ دوں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ تم نہایت

محنتی ٹیچر ہو۔" وہ زیرِ لب مسکرائے۔" یہ عمارت تو تم نے دیکھی ہے۔ لائبریری کے لئے کہاں اتنے کمروں کی ضرورت پڑے گی، اس کے لئے دو کمرے کافی ہوں گے۔" ان کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا" بقیہ عمارت تو اپنے اسکول کے کام آئے گی۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ گئے نا؟"

میں ان کی بات کا مطلب بالکل سمجھ گیا اور علامہ اقبال سے ان کے عشق کا راز بھی اس طرح عیاں ہو گیا کہ چاروں طبق روشن ہو گئے۔ انھوں نے چھپانے کی کوشش بھی نہ کی۔ صاف گوئی سے کام لیا" ابھی تو علامہ اقبال کے بارے میں مہینے کے مہینے جلسے ہو رہے ہیں لیکن ہر مہینے حاضرین کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب بالکل ختم ہو جائے گی تو میں اسکول اس عمارت میں منتقل کر دوں گا۔"

"نام تو علامہ اقبال ہی کے تعلق سے رکھا جائے گا۔" میں نے قیاس آرائی کی۔

انھوں نے میری بات کو پسند نہ کیا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولے" ان کے نام پر لائبریری تو موجود ہی ہے، ویسے بھی ان کے نام پر اسکول، کالج، ادارے، انجمنیں، سڑکیں، اسپتال کیا نہیں ہے؟" انھوں نے مجھے داد طلب نظروں سے دیکھا" اسکول کا نام تو میں فہیم چلڈرن اکیڈمی رکھوں گا۔" نام کی وضاحت بھی خود ہی فرمائی" فہیم میرا چھوٹا بیٹا ہے۔ کیا بتاؤں کتنا ہونہار ہے۔ اقبالؒ سے تو بس پوچھو نہیں اسے کتنی محبت ہے۔ ویسے بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی پود کو اقبال کی عظمت سے باخبر رکھا جائے اور میں یہی کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ آپ یقین جانیں۔" میں نے اپنی پریشانی حالی ایک بار پھر بیان کرنا چاہی، مگر انھوں نے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ صرف وعدہ فردا پر ٹرخا دیا۔ کہنے لگے" بھئی سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میں خود پریشان ہوں، مگر اسکول ادھر منتقل ہوتے ہی تمھاری تنخواہ فوراً بڑھا دوں گا۔ تم محنت سے پڑھاتے رہو۔ میں تمھارا پورا پورا خیال رکھوں گا۔"

مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ ان کا شکریہ ادا کیا، اٹھا اور واپس ہیپی ہیر اسٹار اسکول آ گیا۔

سید انور علی کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد میں نے ملازمت کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی۔ اسی عالم میں ایک مہینہ گزر گیا۔ دوسرا بھی کسی نہ کسی طور کٹ گیا۔ ملازمت کی تلاش میں اسکولوں اور دفتروں

کے چکر کاٹ ہی رہا تھا کہ بچوں کی فیس جمع کرانے کا وقت آ گیا۔ اب میں قلاش ہو چکا تھا۔ کئی روز تک فیس کی رقم مہیا کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔

فیس بروقت نہ پہنچی تو حسبِ دستور جرمانہ لگا اور بچوں کو کلاس میں خفت بھی اٹھانی پڑی۔ انھی دنوں کا ذکر ہے۔ جس کلاس کا میں کلاس ٹیچر تھا، اس کے طلبا کی فیس ہنوز میری ہی تحویل میں تھی۔ اکاؤنٹنٹ رخصت پر تھا۔ فیس کی پوری رقم میں گھر لے گیا۔ بچوں نے بار بار فیس کا تقاضا کیا۔ میں نے پریشان ہو کر سوچا اس رقم میں سے بچوں کی فیس دے دوں، چند روز میں نائٹ اسکول سے تنخواہ مل جائے گی۔ رقم پوری کر کے اکاؤنٹنٹ کے پاس جمع کرا دوں گا۔ یہی سوچ کر میں نے بچوں کو فیس دے دی۔

مگر نائٹ اسکول کا انتظام، خیراتی اسپتال کی مانند تھا۔ تنخواہ کا معاملہ آج اور کل پر ٹلتا رہا۔ غلطی یہ ہوئی کہ بعض گھریلو ضروریات کے لئے بھی فیس کی رقم میں سے خرچ کرتا رہا۔ ایک تہائی سے بھی زیادہ رقم کم ہو گئی۔ سوچا اسکول جاؤں گا تو تقاضہ ہوگا۔ لہٰذا ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی۔ ہفتہ گزر گیا۔ مگر رقم پوری ہونے کے بجائے اور کم ہو گئی۔ نائٹ اسکول سے تنخواہ ہی نہ ملی۔ مل بھی جاتی تب بھی کمی پوری نہ ہوتی۔

دو بار ہیپی ہیرالڈ ائز اسکول کا چپراسی میرے گھر آیا اور میں ہر بار اس سے نہ ملا۔ گھر میں چھپا بیٹھا رہا۔ میری مسلسل غیر حاضری نے پرنسپل صاحب کو سخت برگشتہ کر دیا۔ انھوں نے میرے خلاف پولیس میں رپٹ درج کرا دی۔ رات گئے میں نائٹ اسکول سے واپس ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں دروازے پر پولیس موجود تھی۔ گھر کے اندر جا کر بیوی بچوں کی صورت دیکھنا بھی نصیب نہ ہوئی۔ اسی وقت حراست میں لے لیا گیا اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔

پولیس نے غبن اور دھوکہ دہی کے الزام میں میرے خلاف مقدمہ قائم کیا اور عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ نہ فیس کی رقم پوری کرنے کا کوئی وسیلہ تھا نہ کوئی مقدمے کی پیروی کرنے والا تھا۔ لہٰذا ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ میری بیوی بیچاری روتی دھوتی ہیپی ہیرالڈ ائز اسکول کے مالک سید انور علی کے پاس بار بار گئی، گڑگڑائی، آہ و زاری کی مگر ان کا دل نہ پسیجا۔ ان کے پاس دل ہی کہاں تھا۔ وہ تو ننانوے کے پھیر میں الجھا ہوا تھا۔

کئی ماہ تک مقدمہ چلتا رہا، پیشیاں پڑتی رہیں۔ استغاثہ کے پاس گواہ بھی تھے اور ثبوت بھی موجود تھا۔ عدالت نے خورد برد کرنے کے جرم میں ایک سال قید بامشقت کے ساتھ ساتھ پانچ سو روپے جرمانہ بھی عائد کیا۔ جرمانہ ادا کرنے کی توفیق نہ تھی لہٰذا مزید تین ماہ کی قید کاٹنی پڑی۔ جیل میں کیسے گزری، یہ سن کر کیا کیجئے گا۔ وہ ایک علیحدہ داستان ہے، المناک ہے اور عبرتناک بھی۔

(۴)

جیل سے رہا ہو کر گھر آیا۔ دیکھا تینوں بچے طاعون زدہ چوہوں کی طرح مرگھلے ہو گئے تھے۔ چہرے مرجھا کر مٹیالے پڑ گئے تھے۔ بیوی کے پاس زیورات کی صورت میں جو ٹوم چھلا تھا وہ بک کر پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ گھر کے اخراجات کچھ عرصے تک برتن بھانڈے اور گرہستی کا دوسرا سامان بیچ کر پورے کئے گئے۔ بیوی نے پڑوسیوں کے کپڑوں کی سلائی شروع کر دی۔ سلائی سے اتنی یافت بھی نہ ہوئی کہ گزر بسر ہو سکے۔ اکثر فاقہ پڑتا۔ بچوں کے جسم پر لباس کے بجائے چیتھڑے رہ گئے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی تعلیم کیسے جاری رہ سکتی تھی۔ وہ ان کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی، بات بات پر روتی۔ جیل میں ملاقات کے دن مجھ سے ملنے آتی تو اس کی حالت زار مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ بھی آنسو بہاتی۔ میں بھی روتا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، جسم لاغر اور کمزور پڑ گیا تھا۔ روتے روتے بینائی بھی کم ہو گئی تھی۔

اس قدر بدنام اور رسوا ہو چکا تھا کہ کسی اسکول میں ملازمت ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا مدرسی کو خیرباد کہا۔ ٹائپنگ کا پیشہ اختیار کیا۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد ایک معمولی فرم میں سو سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا مگر وہاں تنخواہ کئی کئی ماہ نہ ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر ٹائپسٹ نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ ملازمت مل جانے کے باوجود کپڑوں کی سلائی پر گزارہ تھا۔

میں نے نوکری نہ چھوڑی۔ البتہ دوسری کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ ایک روز اقبال میموریل لائبریری کے سامنے سے گزرا، حیرت سے دیکھا۔ پھاٹک کے اوپر "فہیم چلڈرن اکیڈمی" کا اتنا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا کہ

دور سے صاف نظر آتا مگر اقبال میموریل لائبریری کا بورڈ کہیں نظر نہ آیا۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک گوشہ میں چھوٹا سا بورڈ دکھائی دیا۔ اس پر دھندلے حروف میں "اقبال میموریل لائبریری" لکھا تھا۔ میں بورڈ کی عبارت پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عین اس وقت اسکول کے بڑے پھاٹک سے ایک چمکتی دمکتی کار برآمد ہوئی۔ اس میں سید انور علی نہایت شان سے براجمان تھے۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی زن سے میرے قریب سے گزر گئی۔

فرم کی ملازمت برائے نام تھی لہذا ایک ہوٹل میں رات کو بیرا گیری کرنے لگا۔ یہ ہوٹل نائٹ کلب بھی تھا۔ شام ہوتے ہی زندگی کے ہنگامے بیدار ہوتے اور آدھی رات تک جاری رہتے۔ شراب کا دور چلتا۔ ارکسٹرا کی تیز مغربی دھنوں پر ملکی اور غیر ملکی رقاصائیں ایسے اشتعال انگیز عریاں اور نیم عریاں رقص پیش کرتیں کہ پسینہ آجاتا۔ مگر اس ہوٹل کی نوکری میں ایک فائدہ ضرور تھا، تنخواہ تو بہت کم تھی مگر بخشش کی صورت میں اچھی خاصی یافت ہو جاتی۔ بچا کھچا کھانا بھی مل جاتا۔ جان پہچان یا پاس پڑوس کا کوئی نظر نہ آتا۔ روزگار سے بھی لگا ہوا تھا اور محلہ میں سفید پوشی کا بھرم بھی قائم تھا۔ البتہ ایک رات، ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ یہ سید انور علی کا لاڈلا بیٹا فہیم تھا۔ یہ ان کا وہی بیٹا تھا جسے علامہ اقبال سے اس قدر محبت تھی کہ اس سے متاثر ہو کر سید انور علی نے پہلے اقبال میموریل لائبریری قائم کی اور پھر فہیم چلڈرن اکیڈمی کے نام سے نیا اسکول کھولا تھا۔ وہ اس وقت نشہ میں دھت تھا اور ایک مصری کیبرے ڈانسر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ فحش اور سوقیانہ حرکات کا دھڑلے سے مظاہرہ کر رہا تھا۔

ادھر میرے تینوں بچوں کا حال یہ تھا کہ دن بھر گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اودھم دھاڑ مچاتے، کشتم کشتا کرتے، لڑائی جھگڑے کرتے۔ آئے دن محلے والے میرے پاس آتے اور ان کے خلاف شکائتیں کرتے۔ آخر ایک پڑوسی کے مشورے پر میں نے ٹوٹو کو موٹر مکینک کا کام سیکھنے کی غرض سے ایک ورکشاپ میں لگا دیا۔ فی فی اور کوکب چھوٹے تھے۔ لہذا فی الحال انھیں اودھم دھاڑ مچانے کے لئے چھوڑ دیا۔

سوچا تھا ٹوٹو کچھ عرصہ بعد کام سیکھ لے گا۔ اس کی تنخواہ مقرر ہو جائے گی کچھ مالی امداد کی سبیل پیدا ہو جائے گی لیکن ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ وہ باورچی خانے کے ایک کونے میں دبکا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

غصہ تو بہت آیا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ یہ تو اس ماحول کا اثر تھا جس میں وہ ان دنوں رہتا تھا ورنہ یہ وہی بچہ تھا، جو ہر روز سویرے ہی سویرے بیدار ہوتا تھا۔ منہ ہاتھ دھوتا تھا۔ برش سے دانت صاف کرتا تھا اور اجلی یونیفارم پہن کر کندھے پر بستہ لٹکائے، ہنستا مسکراتا اس شان سے اسکول جاتا تھا کہ بقول میری بیوی کے کسی بڑے گھر کا بچہ نظر آتا تھا۔

میں نے اسی روز ٹوٹو کو ورکشاپ جانے سے روک لیا موٹر مکینک بنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور چند ہی روز بعد ایک پرچون کی دکان پر بٹھا دیا۔ ٹوٹو پابندی سے صبح ہی صبح دکان پر چلا جاتا۔ دو ڈھائی مہینے بعد ایک شام دفتر سے لوٹتے ہوئے میں دکان کے مالک شیخ حمید کے پاس پہنچا۔ سوچا کہ ٹوٹو اب تک کام سیکھ گیا ہوگا۔ اس کی کچھ تنخواہ لگنا چاہیئے۔ شیخ حمید کے پاس اسی ارادے سے گیا تھا۔ دکان پر پہنچا۔ شیخ حمید سے ملا تو یہ عقدہ کھلا کہ ٹوٹو کئی روز سے دکان پر نہیں گیا تھا۔ میں بہت چکرایا۔ چکرانے کی بات ہی تھی۔ ٹوٹو میرے سامنے صبح دکان پر جاتا تھا اور رات کو گھر واپس آتا تھا۔

گمان گزرا کہ شاید گھر پر موجود ہو۔ کہیں کھیل کود میں بچوں کے ساتھ لگ گیا ہوگا، اس لئے دکان پر نہ پہنچا۔ میں خاموشی سے گھر واپس آیا۔ بیوی سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ٹوٹو تو حسبِ معمول سویرے ہی سویرے گھر سے نکل گیا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا، دکھ بھی ہوا۔ میں ہوٹل بھی نہ گیا۔ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا مگر وہ رات گئے تک نہ لوٹا۔ غالباً اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کی چوری پکڑی گئی۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح ہوگئی، سورج نکل آیا۔ دھوپ منڈیروں پر جھلملانے لگی لیکن ٹوٹو کا کہیں پتہ نہ تھا۔

میں دفتر چلا گیا لیکن ذہن اس قدر پراگندہ تھا کہ ٹائپنگ کرتے ہوئے بار بار غلطی ہوتی۔ شام کو گھر واپس پہنچا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی بیوی سے پہلا سوال ٹوٹو کے بارے میں کیا۔ مگر وہ اب تک نہ آیا تھا ہوٹل گیا وہاں دل نہ لگا۔ جلدی لوٹ آیا۔ آنکھیں ٹوٹو کو ڈھونڈتی تھیں اور اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔

دفتر سے چھٹی لی اور ٹوٹو کی تلاش میں دن بھر مارا مارا پھرتا رہا۔ کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ اخبارات میں "تلاش گم شدہ" کا اشتہار چھپوایا۔ ریڈیو سے بھی گم شدگی کا بار بار اعلان کرایا مگر کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ ٹوٹو کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ بیٹے کی یاد میں ماں کا یہ حال ہوا کہ کھانا پینا چھوڑ

دیا۔ ہر وقت مصلّے پر بیٹھی سجدے پہ سجدے کرتی، گڑگڑا، گڑگڑا کر دعائیں مانگتی، روتے روتے آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے۔ خود میرا عالم یہ تھا کہ بیوی کو تسلی دیتے دیتے بے ساختہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔

ہفتہ بھر سے بھی زائد عرصہ اسی عالم میں گزر گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لیکن ایک رکشا والے نے مشکل کشائی کی۔ اس نے ٹوٹو کے حلیہ کے ایک لڑکے کو زندہ پیر کے مزار پر دیکھا تھا۔ رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ میں اسی وقت ٹوٹو کی تلاش میں روانہ ہوا۔ ریلوے لائن کے اس پار اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا زندہ پیر کی خانقاہ پہنچا۔

اس وقت خانقاہ کا عجب رنگ ڈھنگ تھا۔ ہر طرف شور اور ہنگامہ برپا تھا۔ نیم برہنہ، چیتھڑے لگائے ملنگ، ٹولیوں میں جگہ جگہ سلفہ پر دم لگا رہے تھے فضا میں چرس کی بو رچی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دیکھا کہ ملنگوں کی ایک ٹولی کے ساتھ ٹوٹو بھی بیٹھا تھا۔ ہاں وہی تھا۔ لباس سڑے ہوئے چمڑے کی مانند گندہ اور غلیظ ہو گیا تھا۔ چہرہ خاک سے اَٹا، بال وحشیوں کی طرح کھڑے، میں دم بخود رہ گیا۔ بڑے دکھ کے ساتھ سوچا، کیا یہ وہی بچہ ہے۔ جس کا نام میں نے ایک خوبصورت ہسپانوی بچہ کی تصویر دیکھ کر لانزیرو رکھا تھا۔ جس کی شکل و شباہت اور طور طریقوں میں بڑے آدمیوں کی تمام علامتیں پائی جاتی تھیں۔ جو ہر صبح کندھے پر بھاری بھر کم بستہ لٹکائے جھوم جھوم کر چلتا ہوا اسکول جاتا تھا تو ماں باپ فخر سے ایک دوسرے کو یوں دیکھتے جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہے ہوں۔

"دیکھو، یہ میرا لعل ہے۔ میں اس کا باپ ہوں"۔

"دیکھ لے میں نے جَنا ہے۔ میں اس کی ماں ہوں"۔

آج وہ خوبصورت بچہ، "لانزیرو" وہ مستقبل کا بڑا آدمی جیسے ڈاکٹر، انجنیئر، سائنس داں اور ماہر تعلیم بنانے پر ماں باپ کے درمیان گھنٹوں بحث ہوتی تھی، حتّٰی کہ اَن بن بھی ہو جاتی تھی، ملنگوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھا چرس پر دم لگا رہا تھا۔ نشہ سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ دھواں دھواں تھا اور وہ خود غلاظت کی پوٹ بن گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر جب میں نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی تو وہ زخمی پرندے کی طرح میرے قابو میں آ گیا۔ میں غم و غصہ

سے کانپ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ ٹوٹو کو گھر لایا۔ سوچا اب کیا کیا جائے لیکن میں کچھ نہ کر سکا۔ خاموشی سے بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ البتہ ماں نے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ جب دل کا غبار ذرا ہلکا ہوا تو اسے چمکارا۔ دل جوئی کی، منہ ہاتھ دھلایا، کھانا لا کر سامنے رکھا۔

مگر ٹوٹو نے کھانا نہ کھایا۔ جھنجلا کر ٹھوکر ماری۔ کھانے کی پلیٹ دُور جا گری۔ ماں کو ذرا بھی غصہ نہ آیا وہ پھر بھی ا… سے چمکارتی رہی۔ … نوالہ بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ یہ نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ ہم دونوں نے بچپن ہی سے ٹوٹو کی ایسی ہر ضد ہنس ہنس کر برداشت کی تھی لیکن اس وق… وہ چرس کے نشے میں جھوم … تا۔ ماں چمکارتی تو وہ ایسی خونخوار نظروں سے گھورتا، جیسے ک … اے گا۔ وہ جس قدر لاڈ پیار کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ اسی قدر سرکشی پر اتر آیا تھا۔ بار بار نفرت سے اسکا ہاتھ جھٹک دیتا۔ میں خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ٹوٹو نے ایک بار پھر سالن کی پلیٹ پر لات ماری۔ پلیٹ لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی۔ فرش پر سالن پھیل گیا۔ اس کی سرکشی اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ میں تڑپ کر اٹھا۔ بستر بند کا تسمہ نکالا اور سڑاک سے ٹوٹو کی پیٹھ پر لگایا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اسے مارا تھا لیکن اس وقت تو میں غصہ سے پاگل ہو گیا تھا۔ میں سڑاک، سڑاک چمڑے کا تسمہ مارتا رہا۔ وہ بلبلا کر زمین پر لوٹنے لگا۔ بیوی نے ٹوٹو کو بچانے کی کوشش کی تو میں نے اس کو بھی زور سے دھکا دیا۔ وہ پلنگ سے ٹکرا کر گری۔ میں ٹوٹو کو مارتا ہی رہا، یہاں تک کہ مارتے مارتے ہانپنے لگا۔ جسم لرزنے لگا۔ میں بے سدھ ہو کر فرش پر گر پڑا۔

یہ بڑی ہولناک رات تھی۔ ٹوٹو درد سے تلملا رہا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا۔ بیوی ہاک ہاک کر رو رہی تھی۔ دونوں بچے خوف زدہ ہو کر چیخ رہے تھے۔ میں تانگہ کے گرے ہوئے گھوڑے کی طرح بے حال پڑا تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ تمام آوازیں اس قدر لرزہ خیز معلوم ہوئیں جیسے کوئی جاں کنی کے عالم میں آخری ہچکی لے کر دم توڑ چکا تھا۔ مر گیا تھا۔

میں نے فرش پر پڑے پڑے خواب ناک نظروں سے دیکھا۔ بیوی نے چمکار کر دونوں بچوں کو بستر پر سلا دیا۔ گلاس میں پانی لا کر مجھے پلایا۔ مجھے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ باورچی خانے میں گئی۔ انگیٹھی سلگا کر لائی اور کپڑے کی گدی بنا کر ٹوٹو کے بدن کی چوٹوں کو سینکنے لگی۔ ٹوٹو کا چہرہ قبر

سے نکلے ہوئے مرغے کی طرح ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔

میں نیم بیداری کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا سوچتا رہا۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا یہ میرا ہی گھر ہے؟ یہ سامنے بستر پر میرے بچے لیٹے ہیں۔ وہ انگیٹھی کے قریب ٹوٹو بیٹھا ہے۔ میرا پہلوٹی کا بچہ، جسے میں نے دیوانوں کی طرح مارا ہے۔ اس کے بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے ہیں، جن سے خون رس رہا ہے اور اس کے برابر جو عورت بیٹھی ہے، وہ میری بیوی ہے۔ اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے پیچھے دھندلی دھندلی آنکھیں ہیں۔ وہ رو رہی ہے، سسکیاں بھر رہی ہے۔ یہ سب کہاں سے آگئے؟ میں نے ان کو کیوں اکٹھا کیا؟ میں نے یہ گھر کیوں بسایا؟ کیوں بچوں کا باپ بنا؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں یہ سب کچھ نہ کرتا۔

میں ٹھیک ہی سوچ رہا تھا۔ مجھے وہ شب و روز یاد آ رہے تھے۔ جب میں صرف ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کماتا تھا، بے فکری کی نیند سوتا تھا۔ مزے سے سستے ہوٹلوں میں مردہ خچروں اور کتوں کے گوشت کا سالن اور لکڑی کا برادہ ملی روٹی کھاتا تھا۔ مہینہ کی پہلی تاریخ کو بیس پچیس روپے جیب میں ڈال کر قحبہ خانے جاتا۔ کسی بیسوا کے ساتھ منہ کالا کرتا۔ کبھی کبھار سر چینا کا ادھا چڑھا کر سڑکوں پر آوارہ کتوں کی طرح جھومتا پھرتا۔ زندگی یونہی گزر جاتی۔ کسی روز ہوٹل کا کھانا کھاتا اور ہیضے میں مبتلا ہو کر مر جاتا یا کسی قحبہ خانے میں قتل کر دیا جاتا۔

مگر قحبہ خانے میں میرا قتل نہ ہوا۔ البتہ سستے ہوٹلوں کا کھانا کھا کر ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ مفتوں اسپتال کے جنرل وارڈ میں لاوارثوں کی طرح بستر پر پڑا رہا۔ وہیں میں نے سوچا کہ میرا بھی گھر ہو، میرے لئے بھی کوئی انتظار کرنے والا ہو۔ کوئی میرا دامن پکڑ کر ضد کرے اور مامتا کے جذبے سے سرشار ہو کر میں اسے سینے سے لگا لوں، پیار کروں، سر پر شفقت سے ہاتھ پھیروں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں نے یہ سب کچھ نہ سوچا ہوتا۔ خدایا! میں نے بہت بڑا جرم کیا۔ بدنصیب ہوں، بہت بڑا گنہگار ہوں۔

میں دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ مجھے اپنی آواز بڑی بھونڈی اور بے ہنگم معلوم ہوئی۔ مگر میں روتا رہا، آنسو بہاتا رہا۔ پھر میں نے اپنے شانوں پر بیوی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے سسکیاں بھرتے دیکھا۔ میں چپ رہا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں اور بے خبر ہو کر سو گیا۔

(۵)

ٹوٹو تو بل گیا مگر اسے تلاش کرنے کے چکر میں نائٹ کلب کی بیرا گیری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ البتہ فرم کی ملازمت برقرار رہی۔ تنخواہ بھی ہر مہینے مل جاتی تھی مگر نہ کبھی وقت پر ملی اور نہ یک مشت۔ ٹوٹو کا بیشتر وقت اب گھر ہی میں گزرتا۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ دھینگا مشتی کرتا، شور کرتا، اودھم دھاڑ مچاتا۔

سوا سو روپے ماہانہ آمدنی میں پیٹ بھی نہ بھرتا تھا، تینوں بچوں کو تعلیم کیسے دلاتا، کہاں سے فیس کی رقم لاتا کیونکر ان کی کتابیں اور کاپیاں خرید تا۔ ان کے پیٹ بھی روز بروز پھیلتے جا رہے تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کئی روٹیاں چٹ کر جاتے۔ اگر ان کے پیٹ کا دوزخ نہ بھرتا تو روٹھتے، ضد کرتے، گندی گندی گالیاں بکتے۔ جب تک میں گھر میں رہتا وہ آنکھوں کے سامنے رہتے، میرے باہر نکلتے ہی وہ بھی ماں کی آنکھ بچا کر سٹک جاتے۔ ویسے وہ ماں کو خاطر ہی میں کب لاتے تھے، وہ ڈانٹتی ڈپٹتی تو منہ زوری کرتے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ آنکھیں نکال کر کھڑے ہو جاتے۔ گلی کے آوارہ اور بدقماش لڑکوں کے ساتھ رہتے۔ مار دھاڑ کرتے، طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے۔

میں ان کی شکایتیں سنتا تو دل ہی دل میں کڑھتا، جھنجلا کر سوچتا، یہ بچے تو جونک کی طرح چمٹ گئے ہیں۔ میرا خون پی پی کر مسٹنڈے ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے تو دن کا چین چھین لیا ہے۔ راتوں کی نیند اڑا دی ہے گھر کو جہنم بنا دیا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا عاجز ہو جاتا، جی چاہتا کہ خواب آور گولیاں لا کر تینوں کو کھلا دوں۔ سوتے کے سوتے ہی رہ جائیں۔

مگر میں ان کو خواب آور گولیاں نہ کھلا سکا۔ ایک روز جنون کے عالم میں تینوں کو "محافظِ اسلام" نامی یتیم خانے لے گیا۔ یتیم خانے کا مہتمم تینوں کو داخل کرنے پر راضی ہو گیا۔ لیکن جب اس نے دریافت کیا "ان کے باپ کو فوت ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟" تو میں برداشت نہ کر سکا۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

مہتمم جہاں دیدہ اور سن رسیدہ آدمی تھا۔ فوراً اصل حقیقت تاڑ گیا۔ اس نے اپنی کھچڑی داڑھی پر

ہاتھ پھیرا۔ آنکھوں پر لگا ہوا چشمہ درست کیا۔ تسلی دیتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے یتیم خانے میں ایسے بھی بچے آتے ہیں“۔

میں اس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ ہونق کی طرح اس کا منہ تکنے لگا۔ ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا“۔

زیر لب مسکرا کر بولا۔ ”آپ ان بچوں کے والد ہیں نا؟“

میں نے عین موقع واردات پر پکڑے جانے والے ملزم کی طرح خوف زدہ ہو کر انکار میں گردن ہلا دی۔ ”نہیں، میں اس کا باپ نہیں ہوں۔ یہ تو یتیم ہیں، لاوارث ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی نہیں“۔ کہنے کو تو میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ مگر اس دفعہ میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگا۔

مہتمم نے مردم شناسی کا ثبوت دیا۔ فوراً بات کا رخ بدلا، کہنے لگا۔ ”اچھا اب اس قضیہ کو چھوڑیے، کام کی بات یہ ہے“۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”دیکھئے ایک بچہ تو ابھی چھوٹا ہے لیکن دوسرے دونوں بچوں کے عوض یتیم خانے کی جانب سے آپ کو پچیس روپے فی کس کے حساب سے پچاس روپے ماہانہ ملیں گے“۔

میں رونا دھونا بھول کر حیرت سے مہتمم کو دیکھنے لگا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”آپ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو آ کر یہ رقم یتیم خانہ سے لے جایا کریں۔ ساتھ ہی میں یہ بھی واضح کر دوں، یتیم خانے کے رجسٹر میں ان کو یتیم ہی لکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس خانہ پری پر اعتراض نہ ہوگا“۔

ظاہر ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوراً ہامی بھر لی۔ ”بہت بہتر ہے“۔

مہتمم نے مجھے مزید اطمینان دلایا۔ ”آپ مطلق پریشان نہ ہوں۔ آپ کے بچے یتیم خانے کی تحویل میں رہیں گے۔ ان کو دونوں وقت کھانا ملے گا، پہننے کو کپڑے ملیں گے، تعلیم دی جائے گی، دستکاری بھی سکھائی جائے گی، اچھی طرح دیکھ بھال ہو گی، مناسب تربیت ہو گی، بہت آرام سے یہاں رہیں گے“۔

میں خاموش رہا۔ مہتمم میری دلجوئی کی غرض سے کہتا رہا۔ ”کیا کیا جائے بھائی صاحب، بڑا خراب زمانہ ہے، لوگ خود اپنی اولاد کو یتیم بنا کر یتیم خانے میں داخل کراتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کوئی نرالی بات نہیں ہے۔ وقت

ہی کچھ ایسا ہے کہ اب میں آپ سے کیا عرض کروں۔"

خاصی دیر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتا رہا۔ معاشرے کے بگڑے ہوئے حالات کا رونا روتا رہا۔ یتیم خانے کی فی سبیل اللہ خدمات کی تعریف و توصیف کرتا رہا۔ غرضیکہ جب میں اپنے تینوں بچوں کو داخل کرانے کے بعد یتیم خانے سے لوٹا تو ایسا لگا گویا میرے سر کا بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا' میں خود کو مطمئن اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ہم میاں بیوی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یتیم خانہ محافظ اسلام کے دفتر جاتے' مہتمم سے پچاس روپے ماہانہ وصول کرتے اور تینوں بچوں سے بھی مل لیتے۔ وہ بے پھندنے کی ترکی ٹوپیاں اور ایک سے ہی کپڑے کی ڈھیلی ڈھالی شیروانیاں پہنے' ہمارے سامنے آکر مودب کھڑے ہو جاتے' ان کے چہروں پر اب یتیموں کی سی لاوارثی برسنے لگی تھی۔ وضع قطع سے بھی وہ بالکل یتیم و یسیر نظر آتے تھے۔ شروع شروع میں تو ماں ان کو دیکھتے ہی رو پڑتی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ بھی میری طرح ان باتوں کی عادی ہو گئی۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یتیم خانے سے ملنے والی رقم میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اب ٹوٹو اور نی نی کے عوض اسی روپے ماہانہ ملتے تھے۔ کوکب کا بھی بیس روپے معاوضہ ملنے لگا۔ ہر مہینے سو روپے ملتے تھے۔ میں بھی خوش تھا اور بیوی بھی۔ اطمینان اور یکسوئی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ بچوں کی طرف سے بھی اطمینان تھا۔ وہ آوارہ گردی اور بے راہ روی سے محفوظ تھے۔ یتیم خانے کے مکتب میں دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے گھریلو صنعت اور دستکاری کی تربیت پا رہے تھے۔

مجھے فرم کے ایک کام کے سلسلے میں حیدرآباد جانا پڑا۔ بس کا سفر تھا۔ آگے کی نشست پر دو نوجوان شکل و صورت سے تعلیم یافتہ نظر آتے تھے۔ مشرقی پاکستان کی سنگین صورت حال کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے بات چیت کر رہے تھے۔ ایک اسٹاپ آیا۔ بس ٹھہر گئی۔ کچھ مسافر اترے' کچھ سوار بھی ہوئے۔ بس آگے روانہ ہوئی اچانک عقب سے گھسی پٹی لے میں وہ دکھڑا شروع ہوا جو بس اور ریل گاڑی کے سفر میں عام طور پر سنائی دیتا ہے۔

"یتیموں کی فریاد سن لیجئے گا!

گئے ہم سے ماں باپ ہمارے بچھڑ۔

بحث کرنے والے نوجوانوں کو یہ دخل درمعقولات نہایت شاق گزرا۔ انھوں نے کنڈکٹر کو بلاکر کہا۔ "یار نکالو ان سالوں کو۔ خواہ مخواہ شور مچانا شروع کر دیا۔" کنڈکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ اس طرح منع کیا کہ خاموشی چھاگئی۔

ذرا دیر بعد پچھلی نشستوں سے زور زور سے بولنے اور تکرار کرنے کی آوازیں ابھریں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کنڈکٹر دو بچوں کو غصے سے ڈانٹ رہا تھا "تم بس کے اندر سگریٹ نہیں پی سکتے۔" مگر وہ سگریٹ نوشی پر بضد تھے۔

میں نے دونوں کو غور سے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ٹوٹو اور فی فی تھے۔ ٹھاٹھ سے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اور ڈھٹائی سے ہنس رہے تھے، کنڈکٹر سے ٹھٹھول بازی کر رہے تھے۔

کنڈکٹر نے جھنجلا کر بس رکوائی، دونوں کو نہایت گندی گالی دی۔ ٹوٹو کو کان پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ فی فی نے مداخلت کرنا چاہی تو اس کے گال پر تڑاخ سے طمانچہ رسید کیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ بے قرار ہو کر اٹھا۔ ان کی جانب بڑھا۔ دونوں نے مجھے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ٹوٹو تو چپ رہا مگر فی فی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ابا" مجھے سخت دھچکا لگا۔ دماغ جھنجھنا اٹھا۔ لپک کر قریب پہنچا۔ پہلے تو دونوں کی اچھی طرح مرمت کی۔ پھر دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ کنڈکٹر کے ہاتھوں مار کھلوانے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ خود ہی ان کی کندی کر دوں تاکہ نہ ذلت اٹھانی پڑے نہ دل کو چوٹ لگے۔

میں نے بیوی سے اس المناک واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ اسے ویسے ہی کم دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات سنتی تو رو رو کر بالکل اندھی ہو جاتی۔ سوچا، پہلی تاریخ کو تنہا جاؤں گا۔ یتیم خانے کے مہتمم سے کھل کر بات کروں گا، زور دوں گا کہ یتیم خانے کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام میرے بچوں سے نہ لیا جائے۔ انھیں کوئی ہنر سکھایا جائے۔ اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوا تو گھر واپس لے آؤں گا، اس طرح تو وہ آگے چل کر پیشہ ور گداگر بن جائیں گے آوارہ اور بدقماش ہو جائیں گے۔

مگر میں پہلی تاریخ کو فرم کی بعض مصروفیات کے باعث نہ جا سکا۔ پورا مہینہ نہ جا سکا۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ کے بجائے نو تاریخ کو یتیم خانے پہنچا۔ مہتمم کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر پہلی سی نرمی

اور شگفتگی نہ تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ بے رخی سے بولا۔

"اب کیا لینے آئے ہیں؟"

اس کی بات سن کر میں سخت چکرایا۔ ہچکچاتے ہوئے پوچھا" میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا"۔

اس نے ٹوہ لگانے والی نظروں سے مجھے دیکھا" آپ اپنے بچوں ہی سے ملنے آئے ہیں نا؟"

میں نے صاف دلی سے کہا" جی ہاں۔ بالکل ان ہی سے ملنے آیا ہوں اور پہلی بار نہیں آیا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے"۔

"مگر آپ کے بچے پچھلے ڈیڑھ ماہ سے بھی زیادہ عرصے سے یہاں نہیں ہیں"۔

"یہاں نہیں ہیں؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا" کہاں ہیں وہ؟"

"تو گویا آپ کو کچھ پتہ نہیں؟" اس بار اس کے لہجہ میں بھی حیرت کا عنصر شامل تھا۔

میں نے پریشان ہو کر کہا" خدا بہتر جانتا ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم"۔

مسکرا کر بولا" بھائی صاحب، وہ تو میرے بھی استاد نکلے"۔ اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا" آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے انھوں نے اپنا یتیم خانہ کھول لیا ہے"۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔ یقین نہ آنے کے انداز میں بولا" انھوں نے یتیم خانہ کھول لیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسے ہی جیسے میں آپ سے بتا رہا ہوں" وہ بدستور مسکراتا رہا۔

عرض کیا" صاف صاف بتائیے۔ میں اب تک کچھ نہیں سمجھ سکا"۔

اس دفعہ اس نے وضاحت سے بتایا" انھوں نے ایک نہیں کئی یتیم خانے کھول رکھے ہیں مگر ان کا کہیں وجود نہیں، صاف بات یہ ہے کہ وہ جعلسازوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئے ہیں جس نے مختلف یتیم خانوں کے نام سے جعلی رسید بکیں چھپوا رکھی ہیں۔ ان کے نام پر چندہ جمع کرتے ہیں اور مل بانٹ کر کھا جاتے ہیں۔ ملک میں ایسے جعلسازوں کے نجانے کتنے گروہ ہیں۔ وہ یتیم خانوں کے بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں، شہر شہر گھومتے پھرتے ہیں۔ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے یتیموں کے نام پر مخیر اور خدا ترس لوگوں سے چندہ اینٹھتے ہیں اور بغیر ڈکار لے نگل جاتے ہیں۔ یتیم خانوں کے نام پر یہ دھندا بہت عام ہے"۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری" مصیبت

یہ ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں ہوتی۔"

"یقین مانیے مجھے اس سلسلہ میں کچھ بھی خبر نہیں"۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"مجھے آپ کی بات پر پورا یقین ہے"۔ اس نے اطمینان دلایا۔

میں نے تڑپ کر پوچھا "آپ کو پتہ ہے کہ وہ کہاں ہیں؟"

اس نے بتایا "ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پچھلے مہینے تینوں کو ملتان اور لاہور میں دیکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ پنجاب کے کسی شہر میں ہوں گے۔ ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ کچھ روز جعلی یتیم خانوں کے نام پر کمائی کرتے ہیں۔ پھر کسی دوسرے شہر چلے جاتے ہیں۔"

مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ گم صم بیٹھا رہا۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مہتمم نے میری آزردگی کو تاڑ لیا۔ دلجوئی کرتے ہوئے بولا "آپ مجھ سے ملتے رہیں، جوں ہی ان کے بارے میں صحیح اطلاع ملی، آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ انھیں واپس لانا چاہیں اور جعل سازوں کے چنگل سے چھڑانا چاہیں تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ جیسے وہ آپ کے بچے ہیں ویسے ہی میرے بھی ہیں۔ میں ان کو تباہی و بربادی کے گڑھے سے نکالنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔"

اس کی دلجوئی اور یقین دہانی سے میں بہت متاثر ہوا۔ دل شکستہ اور دل گرفتہ، یتیم خانہ محافظِ اسلام کے دفتر سے باہر نکلا۔ نڈھال اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ بیوی سے اپنی بے قراری چھپا نہ سکا اور سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ کچھ دیر وہ سکتہ کے عالم میں بیٹھی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے میں بھی امڈتے جذبات کے ریلے میں بہہ گیا۔ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ ایک روز کا نہیں، اب تو یہ جنم جنم کا رونا ہو گیا تھا۔

(۶)

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جمعہ کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت تھا۔ میں اپنی فرم کے منیجر سے ملنے نکلا تھا۔ وہ ان دنوں علیل تھے۔ دفتر نہ آتے تھے گھر پر بلایا تھا۔ ٹائپنگ کا کچھ کام کرانا تھا۔ ان کے مکان کا مجھے صحیح پتہ معلوم نہ تھا۔ پہلی بار آنا ہوا تھا۔ مکان تلاش کرتا ہوا ایک سڑک سے مڑا تو دور سے سید انور علی کے اسکول کا بورڈ نظر آیا۔ قریب

پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ ایک نیا عجوبہ دیکھا۔ "فہیم چلڈرن اکیڈمی" کا بورڈ غائب تھا۔ "اقبال میموریل لائبریری" کا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا۔

عمارت بالکل سنسان تھی، نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز، پھاٹک بند تھا۔ صرف اس کا چھوٹا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ سوچا اندر جاکر اس تبدیلی کا راز معلوم کیا جائے جس نے میرے ذہن میں کھلبلی مچادی تھی۔ آگے بڑھا جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ وسوسوں نے سر ابھارا، انور علی مل گئے تو کیا ہوگا؟ مگر یہ سوچ کر خود کو مطمئن کیا۔ فیس خرد برد کرنے کا واقعہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ انور علی اسے بھول بھال چکے ہوں گے اور اگر انھوں نے اس کا ذکر نکالا بھی تو معذرت کرلوں گا۔ قصور بہرحال میرا ہی تھا۔

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کوئی نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عمارت کے قریب پہنچا۔ سیڑھیاں طے کیں۔ برآمدے میں پہنچا۔ ایک کمرے پر سید انور علی کے نام کی تختی لگی تھی مگر اس کا دروازہ بند تھا باہر سے تالا لگا تھا البتہ برابر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ بے دھڑک اس میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے عین سامنے میز تھی۔ میز کے پیچھے کرسی پر خلیل احمد بیٹھا تھا۔ اس سے پرانی شناسائی تھی۔ وہ ہیپی پیراڈائز اسکول میں کلرک تھا۔

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا، اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پوچھا۔ "باقر صاحب! آج آپ ادھر کیسے بھول پڑے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا انور علی صاحب سے نیاز حاصل کرلوں۔ مگر وہ تو اس وقت موجود نہیں۔ یہاں آتے تو ہوں گے؟"

خلیل احمد نے بتایا۔ "کبھی کبھار آتے ہیں۔ مگر آج نہیں آئیں گے۔"

میں نے قیاس آرائی سے کام لیا۔ "ہیپی پیراڈائز اسکول گئے ہوں گے۔"

"وہ تو کب کا ختم ہو گیا۔" خلیل احمد نے مطلع کیا۔ "اس کا نام بھی بدل گیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو اس عمارت میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے تو یہاں فہیم چلڈرن اکیڈمی کا بورڈ بھی دیکھا تھا۔ مگر وہ بورڈ اب نظر نہیں آیا۔ اسکول کہاں چلا گیا؟"

"اس سال موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوئیں تو اسکول بند کر دیا گیا۔" خلیل احمد نے بتایا۔ "تمام ٹیچروں کو علیحدہ کر

کر دیا گیا۔ اسکول کا فرنیچر اور دوسرا سامان کچھ تو فروخت کر دیا گیا، کچھ انور علی صاحب اپنے گھر لے گئے۔"

"مگر انھوں نے اسکول کیوں بند کر دیا؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "اسکول تو بہت اچھا چل رہا تھا۔"

کہنے لگا۔ "انور علی صاحب کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں، ہمیشہ بہت دور کی سوچتے ہیں۔" اس نے کھل کر بات نہ کی مگر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ انور علی سے خوش نہ تھا۔ اس کے لہجے میں گلہ تھا۔

میں نے کرید کر پوچھا۔ "اسکول بند کرنے کا کوئی تو سبب ہوگا؟ بلا سبب تو اسکول بند نہیں کیا جا سکتا۔"

دبی زبان سے بولا۔ "آپ سے کیا چھپانا۔ اصل بات یہ ہے کہ پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کو قومی ملکیت قرار دے کر سرکاری تحویل میں لیا جا رہا ہے۔ انور علی کا اثر و رسوخ تو آپ جانتے ہیں، کہاں نہیں ہے۔ انھیں کسی نہ کسی طرح پیشگی اطلاع مل گئی۔ سرکاری تحویل میں جانے سے پہلے پہلے سب کچھ صاف بچا لے گئے۔"

"کیا بچا لے گئے۔ اسکول کا فرنیچر؟ وہ کتنے کا ہوگا؟" میں نے قدرے تیکھے لہجہ میں کہا۔ "فرنیچر کی خاطر انھوں نے چلتا چلاتا اسکول بند کر دیا۔ سارے ٹیچروں اور عملے کے دوسرے افراد کو بے روزگار کر دیا۔"

"باقر صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ انھیں کسی کے بیروزگار ہونے سے کب سروکار رہا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے۔ گرمی کی تعطیلات کے ساتھ ہی ٹیچروں کی ملازمت ختم کر دی جاتی تھی۔" خلیل احمد کھل کر بات کرنے لگا۔ "ابی انھوں نے تو اس عمارت کو بچا لیا۔ یہ تو ان کے قبضے میں رہے گی۔ سنا ہے اب تو اس زمین کا الاٹمنٹ بھی انھوں نے اپنے ہی نام کرا لیا ہے۔" وہ زیرِ لب مسکرایا۔ "اسکول قومی ملکیت قرار دیا جاتا تو اس کے ساتھ یہ زمین اور جائداد سب ان کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"بھئی اپنے انور علی صاحب بھی بڑی چلتی رقم ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پہلے سے پیش بندی کر لیتے ہیں۔ لائبریری کا بورڈ بھی انھوں نے کسی مصلحت سے لگا رکھا ہے۔"

"یہ بورڈ تو ان کے لئے بہت بڑی ڈھال ہے جب تک یہ موجود ہے ان پر ذرا آنچ نہیں آئے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کیا کر رہے ہو؟"

"فی الحال تو میں آفس سکریٹری ہوں۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مگر آثار نظر آ رہے ہیں کہ مجھے بھی دوسروں کی طرح جلد ہی نکال باہر کیا جائے گا۔ صرف لائبریری کا بورڈ رہ جائے گا اور سید انور علی صاحب۔"

"مگر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ انور علی صاحب کو اس سے کیا حاصل ہوگا ؟"

خلیل احمد نے بتایا "ہو سکتا ہے وہ پھر یہاں اپنا اسکول کھول لیں۔ انور علی صاحب کو تو یہی امید ہے۔ آپ جانتے ہیں امید پر تو دنیا قائم ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ بات آئی گئی ہوگی۔

(۷)

ملک میں ایک بار پھر مارشل لا لگا۔ پرانی حکومت ختم ہوئی۔ نئی حکومت قائم ہوئی۔ نت نئے قوانین اور آرڈی ننس نافذ ہوئے۔ نجی تعلیمی ادارے قائم کرنے کے بھی احکامات جاری ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر محلے، ہر گلی میں اسکولوں کے بورڈ نظر آنے لگے۔ سب انگلش میڈیم اسکول ہیں اور عام طور پر کسی نہ کسی مسیحی سینٹ کے نام پر ہیں۔ ہونا بھی چاہیئے کہ ایسے اسکولوں میں خوب تگڑی فیس وصول کرنے کی پوری گنجائش ہوتی ہے۔

میں نے ایک بار پھر دیکھا "اقبال میموریل لائبریری" کا بورڈ مختصر ہو گیا اور اس پر لکھی ہوئی عبارت کے حروف بھی دھندلے پڑ گئے تھے۔ پھاٹک کے اوپر "فہیم چلڈرن اکیڈمی" کا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا۔ انور علی کی چمکتی دمکتی کار نہایت شان سے پھاٹک میں داخل ہوتی، وہ کار سے اتر کر خراماں خراماں اپنے دفتر کی جانب بڑھتے۔ چپراسی ادب سے سلام کرتا۔ بڑھ کر دروازہ کھولتا اور وہ اندر داخل ہو جاتے۔ چپراسی، اس تختی کے عین نیچے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ جاتا جس پر خوبصورت حروف میں "پرنسپل" لکھا تھا۔

انور علی کا اسکول اب دو شفٹوں میں چلتا ہے۔ فیس کافی تگڑی وصول کرتے ہیں۔ یعنی ڈیڑھ سو روپے ٹیوشن فیس اور سو سے سوا سو روپے تک فاصلے کے مطابق بس کا کرایہ۔ اسکول کی اپنی بسیں ہیں جن میں ہر صبح بچوں کو بوریوں کی طرح ٹھونس دیا جاتا ہے۔ جس کلاس میں تیس بچوں کی گنجائش ہے، ساٹھ پینسٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہر سال طلباء کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور اس اضافہ کے ساتھ ساتھ اسکول پر دھن برس رہا ہے۔ یوں سمجھیے سید انور علی دولت میں کھیل رہے ہیں۔ لکشمی ان کے قدم چومتی ہے۔ ان کے چھوٹے بچے اور بچیاں گھوڑا گلی اور مری کے شاندار اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ پُر فضا مقامات

پر رہتے ہیں۔ اپنے مستقبل کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بناتے ہیں۔ بڑا لڑکا ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنے کے بعد واپس آگیا ہے۔ اس کا ذاتی کلینک ہے، نامور سرجن ہے۔ ایک آپریشن کے پانچ ہزار نقد سکہ رائج الوقت وصول کرتا ہے۔ ایک ایکڑ سے بھی زیادہ بڑے قطعہ اراضی پر بہت عالیشان اسپتال تعمیر کر رہا ہے۔ دوسرا انجینئر ہے اور کسی امریکی تحقیقاتی ادارے میں ملازم ہے۔ ملک کو زرمبادلہ بھی کماکر نہیں بھیجتا اس نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ گرین کارڈ حاصل کرلیا ہے۔ امریکہ ہی میں مستقل رہائش اختیار کرلی ہے۔

میرے بچوں کا حال احوال بھی سن لیجئے، ٹوٹو اور نی نی ملتان سنٹرل جیل میں ہیں پہلے جعل سازی کے جرم میں قید ہوئے۔ جیل میں عادی مجرموں کے ساتھ رہ کر طاق ہوگئے۔ رہا ہوئے تو ڈکیتی اور رہزنی کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ جرائم کی دنیا میں خوب نام کمایا۔ نہایت دیدہ دلیری سے ڈاکے ڈالتے تھے۔ پکڑے گئے۔ اب قید بامشقت کاٹتے ہیں۔ کوکب نے جیب کاٹنے کے فن میں مہارت حاصل کی۔ ایک بار جیب کاٹنے کے بعد چلتی بس سے کود کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر دونوں پیر پہیوں کے نیچے آکر کٹ گئے۔ وہ حیدرآباد میں ہے۔ اپاہج ہونا اس کی کمائی کا وسیلہ بن گیا۔ ہاتھوں کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے۔ دردناک صدا لگاتا ہے۔ فقیروں کا بھیس بناکر تماشائے اہل کرم دیکھتا ہے۔ وہ ایک منجھا ہوا گداگر بن چکا ہے۔

میرا عالم یہ ہے کہ بیکار اور ناکارہ ہوں۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ بیوی کماتی ہے اور میں کھاتا ہوں۔ وہ پڑوسیوں کے کپڑے سیتی ہے۔ دن رات کھٹاکھٹ مشین چلاتی ہے۔ اس کی بینائی کمزور اور کمزور ہوتی جارہی ہے۔ چشمہ کا نمبر بڑھتے بڑھتے آخری حد تک پہنچ گیا ہے۔ پھر نہ نمبر بڑھ سکے گا، نہ وہ دیکھ سکے گی، اندھی ہو جائے گی۔ میں پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر رہ گیا ہوں۔ سید محمد باقر کے بجائے اس کا جیتا جاگتا میموریل بن گیا ہوں۔ لوگ مجھے خبطی اور دیوانہ کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہیں مجھے جہاں اور جس جگہ ایسا بورڈ نظر آتا ہے جس پر اس قسم کی عبارت درج ہوتی ہے۔

بچے قوم کی امانت ہیں۔

بچے نئے پاکستان کے معمار ہیں۔

اپنے بچوں کا مستقبل درخشندہ بنایئے۔

مجھ پر فوراً ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دیوانگی کا ایسا شدید دورہ پڑتا ہے کہ میں ہر ایسے بورڈ پر پان کی پیک تھوک دیتا ہوں۔ کیچڑ، غلاظت، گھوڑوں کی لید۔ جو کچھ ہاتھ میں آتا ہے کھینچ مارتا ہوں، کسی نہ کسی طور بورڈ کا ستیاناس کر دیتا ہوں۔ اس کی عبارت مٹا دیتا ہوں۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔

میری اس دیوانگی پر راہ گیر ٹھٹک جاتے ہیں، ہنستے ہیں، نفرت سے منہ بگاڑتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ پچھلے ہی مہینے میری ایسی ہی حرکت پر ایک شخص نے غصہ سے مجھے اس بے دردی سے مارا کہ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ بایاں رخسار پھٹ گیا۔ اس کا نشان ہلال کی صورت میں اب تک موجود ہے لیکن میری دیوانگی میں پھر بھی فرق نہ آیا۔ جی چاہتا ہے کوئی سر پر جوتا مار کر کہے "ابے گھر بسائے گا" کوئی ٹھوکر مار کر کہے "الو کے پٹھے باپ بنے گا" کوئی میرے منہ پر تھوک کر کہے "کیوں بے، اپنے بچوں کا مستقبل روشن بنانے کی کوشش کرے گا"

لوگو! خدا کے لئے مجھے اس طرح قہر آلود نظروں سے نہ دیکھو۔ میرے حال پر یوں نہ ہنسو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں انسان کے ہاتھوں ستایا ہوا ایک انسان ہوں ایک باپ ہوں، لو، میں نے تمہارے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔

دل صاحب اولاد سے، انصاف طلب ہے!

معیاری ادب

کے نئے اُفق

رکتاب - کراچی